ISSN 2221-1659

سہ ماہی سماجی و دینی تحقیقی مجلّہ

نورِ معرفت

جلد:10 شمارہ:3 مسلسل شمارہ:45 جولائی تا ستمبر 2019ء

تکریم فاطمہ سلام اللہ علیہا
تعلیم و تربیت کے بنیادی اصول
سائنس اور دین کے درمیان رابطہ
معاشرتی ترقی میں ادب کا کردار
انسانیت، معیشت اور ماحولیات
تربیت، لغوی مفہوم و خصوصیات
الٰہی صفات کے معانی کی شناخت
بچوں کی تعلیم و تربیت میں جسمانی سزا
اقوام متحدہ کا 2030 ترقیاتی ایجنڈا؛ ایک تنقیدی جائزہ

www.nmt.org.pk
نور الہدیٰ مرکز تحقیقات (اسلام آباد)

Quarterly social & religious research journal

NOOR-E-MARFAT

Indexed by:

https://www.australianislamiclibrary.org/noor-e--marfat.html

https://www.iri.aiou.edu.pk/indexing/?page_id=37857

https://www.archive.org/details/@noor-e-marfat

Applied for Indexing in

https://orcid.org

https://www.brill.com

https://www.ebsco.com

https://www.noormag.ir

https://www.almanhal.com

https://www.scienceopen.com

https://www.aiou.academia.edu/NooreMarfat

https://www.scholar.google.com/citations?user=ZAJjGSMAAAAJ&hl=en

ISSN 2221-1659 Declaration No: 7334

سہ ماہی سماجی و دینی تحقیقی مجلّہ

نورِ معرفت

NOOR-E-MARFAT

جلد:10 شمارہ:3 مسلسل شمارہ:45

جولائی تا ستمبر 2019ء

بمطابق

ذیقعدہ تا محرم الحرام 1441ھ

مدیر

ڈاکٹر شیخ محمد حسنین

نور الہدیٰ مرکز تحقیقات، اسلام آباد

E-mail: noor.marfat@gmail.com

مقالہ نگاروں کے لئے چند ضروری ہدایات

سہ ماہی سماجی و دینی تحقیقی مجلّہ "نور معرفت" کا ایک اہم ہدف، سماجی، دینی موضوعات پر اسلامی نقطہ نگاہ سے لکھے گئے مقالات کی اشاعت کے ساتھ ساتھ علمی مراکز کے اساتذہ اور طلاب کے درمیان تحقیقی ذوق پیدا کرنا اور محقق پروری ہے۔ یہ مجلّہ علماء اور دانشور حضرات کو دعوت دیتا ہے کہ وہ دینی، سماجی موضوعات پر اپنے قیمتی مقالات سے اس مجلّہ کے صفحات کو مزیّن فرمائیں۔ گزارش ہے کہ مقالات کی تدوین میں درج ذیل ہدایات کی مکمل پابندی کی جائے:

1. مقالہ غیر مطبوعہ اور ترجیحی بنیادوں پر کمپوز شدہ ہو۔
2. مقالہ کی ضخامت 5500 الفاظ سے زیادہ اور 9000 الفاظ سے زائد نہ ہو۔ مقالہ کلیدی کلمات پر مشتمل ہو۔ نیز 120-140 الفاظ پر مشتمل اردو، انگریزی خلاصہ (Abstract) بھی بھیجا جائے۔
3. مقالہ کی تیاری میں اصلی مآخذ اختیار کریں ۔ اگر مقالہ کی Plagiarism Report 18% سے زائد ہوئی تو قابل اشاعت نہ ہوگا۔
4. مجلّہ کا مقالہ نگار کی تمام آراء سے متفق ہونا ضروری نہیں۔ لہٰذا مجلّہ مقالات کی تہذیب کا حق رکھتا ہے۔
5. مقالات Peer Review کے بعد ماہرین کی منظوری سے شائع کیے جائیں گے۔
6. اور مقالات ترجیحی بنیادوں پر ایسے موضوعات پر ہوں جو ادارہ تجویز کرے۔
7. مقالات میں حوالہ جات مقالہ کے آخر میں Endnotes کی صورت میں CMOS کے مطابق لکھے جائیں۔ کتابیات بھی اسی Reference Style کے مطابق مرتب کی جائیں۔

- **کتاب سے حوالہ جات میں Eootnotes کے لئے درج ذیل طریقہ اپنائیں:**

Number. First name Last name, *Title of Book* (City; Publisher; year), page[s] cited [or chapter number, if no page numbers], URL [incorporating DOI when possible].

مثال کے طور پر:

1۔ ناصر، مکارم شیرازی، *تفسیر نمونہ*، ج1، ترجمہ: سید صفدر حسین نجفی (لاہور، مصباح القرآن ٹرسٹ، 1417ھ) 58۔

- **کتاب کی Bibliography کے لئے درج ذیل طریقہ اپنائیں:**

Last name, First name. Title of Book. City: Publisher; year. URL [incorporating DOI when possible].

مثال کے طور پر: الزبیدی، سید مرتضی، *تاج العروس*، بیروت، دار الفکر للطباعۃ والنشر والتوزیع، 1994ء۔

- **علمی تحقیقی مجلات سے حوالہ جات میں Endnote کے لئے درج ذیل طریقہ اپنائیں:**

Number. First name Last name, " Title of Article", Journal volume, no. issue (year): page[s] cited, URL [when online version is consulted].

مثال کے طور پر:

1۔ سید رمیز الحسن، موسوی، "عبقات الانوار فی امامۃ الائمۃ الاطہار" سہ ماہی سماجی، دینی تحقیقی مجلّہ نور معرفت، جلد 7، شمارہ 3-4 (2017): 170

https://iri.aiou.edu.pk/indexing/wp-content/uploads/2018/04/10-Abqat-ul-Anwar-fi-Imamat-il-Aemmatil-Athar.pdf

- **علمی تحقیقی مجلات کی Bibliography کے لئے درج ذیل طریقہ اپنائیں:**

Last name, First name, " Title of Article", *Journal* volume, no. issue (year): page span. URL [when online version is consulted].

مثال کے طور پر: موسوی، سید رمیز الحسن، "عبقات الانوار فی امامۃ الائمۃ الاطہار" سہ ماہی سماجی، دینی تحقیقی مجلّہ نور معرفت، جلد 7، شمارہ 3-4 (2017): 165-184۔

https://iri.aiou.edu.pk/indexing/?cat=5128.

- اگر کسی کتاب کا مولف معلوم نہ ہو تو Footnote اور Endnote دونوں میں خود کتاب کا عنوان سب سے پہلے درج ہوگا۔
- کتابوں اور مجلات وغیرہ کے نام *Italicized* شکل میں لکھے جائیں گے۔
- معروف شہروں کے نام کے ساتھ ملک یا صوبہ کا لکھنا ضروری نہیں ہے۔ لیکن غیر مشہور شہروں کے نام کے ساتھ ملک، صوبہ کا نام لکھنا بہتر ہے۔ نیز صفحہ نمبر درج کرنے سے پہلے ص یا صص نہ لکھنا بہتر ہے۔ محض نمبر لکھنے پر اکتفاء کریں۔
- کسی بھی منبع (Source) سے پہلی بار حوالہ میں منبع کی مکمل تفصیلات درج کریں۔ لیکن سابقہ منبع سے بلا فاصلہ حوالہ میں ایضا (Ibid) لکھیں اور اگر جلد یا صفحہ کی تبدیلی ہے تو درج کریں۔ مثال کے طور پر: ایضا، ج 2، 109۔ لیکن اگر درمیان میں کسی دوسرے منبع کا حوالہ حائل ہوا ہے تو پچھلے منبع کے مصنف کا دوسرا نام، کتاب کا نام، جلد اور صفحہ نمبر درج کریں۔ مثال کے طور پر: مکارم شیرازی، تفسیر نمونہ، ج 1، 121۔

ضروری نوٹ: مزید معلومات کے لئے آن لائن Chicago Manual of Style Reference ملاحظہ فرمائیں۔

ناشر: سید حسنین عباس گردیزی

پریس: پکٹوریل پریس آبپارہ اسلام آباد

معاون دفتری امور: طاہر عباس

کمپوزنگ وڈیزائننگ: بابر عباس

رجسٹریشن فیس پاکستان، انڈیا: 500 روپے؛ مڈل ایسٹ: 70 ڈالرز؛ یورپ، امریکہ، کنیڈا: 150 ڈالرز۔

مجلس ادارت

سرپرست اعلیٰ

سید امتیاز علی رضوی

سرپرست

سید علی مرتضیٰ زیدی

مدیر اعلیٰ

سید حسنین عباس گردیزی

مدیر

ڈاکٹر شیخ محمد حسنین

معاون مدیر

ڈاکٹر قیصر عباس جعفری

سید رمیز الحسن موسوی

ڈائریکٹر نور الہدیٰ مرکز تحقیقات

ڈاکٹر روشن علی

اسلام آباد ماڈل کالج فار بوائز، اسلام آباد

ڈاکٹر علی رضا طاہر

پنجاب یونیورسٹی، لاہور

ڈاکٹر ساجد علی سبحانی

المصطفیٰ انٹرنیشنل یونیورسٹی، اسلام آباد

ڈاکٹر ابوتراب

قائداعظم یونیورسٹی، اسلام آباد

قومی مجلس مشاورت

ڈاکٹر سید نثار حسین ہمدانی

اے۔ جے۔ کے یونیورسٹی، آزاد کشمیر

ڈاکٹر حافظ محمد سجاد

علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی، اسلام آباد

ڈاکٹر کرم حسین ودھو

ریجنل ڈائریکٹوریٹ آف کالجز (لاڑکانہ)

ڈاکٹر قندیل عباس کاظمی

قائداعظم یونیورسٹی، اسلام آباد

ڈاکٹر محمد ریاض

بلتستان یونیورسٹی، اسکردو

بین الاقومی مجلس مشاورت

ڈاکٹر سید راشد عباس نقوی

اہل بیت یونیورسٹی تہران، ایران

ڈاکٹر یعقوب بشوی

جامعۃ المصطفیٰ العالمیہ قم، ایران

ڈاکٹر سید تلمیذ حسنین رضوی

نیو جرسی، امریکا

ڈاکٹر غلام حسین میر

جامعۃ المصطفیٰ العالمیہ قم، ایران

ڈاکٹر سکینہ حسین۔ آسٹریلیا

مقالہ نگاروں کا تعارف

محب رضا۔ موسسہ علوم انسانی، جامعہ المصطفیٰ العالمیہ، قم

E-Mail: mohib.raza@gmail.com

ڈاکٹر سید محمد فہیم عباس ہاشمی، یونیورسٹی آف تہران

E-Mail: faheemhashmi76@yahoo.com+

ڈاکٹر انصار الدین مدنی۔ اسسٹنٹ پروفیسر، قراقرم یونیورسٹی گلگت

E-Mail: dransarmadni@gmail.com

ڈاکٹر فضّہ مسلم۔ ویزٹنگ فیکلٹی ممبر، قراقرم یونیورسٹی گلگت۔

E-Mail: drfizzahmuslim@gmail.com

ڈاکٹر شیخ محمد حسنین۔ مدیر مجلّہ نور معرفت ، اسلام آباد۔

E-Mail: sheikh.hasnain26060@gmail.com

ڈاکٹر سجاد علی رئیسی۔ اسسٹنٹ پروفیسر، شاہ عبداللطیف یونیورسٹی، خیرپور میرس

E-Mail: sajjad.ali@salu.edu.pk

ہاشم رضا عابدی۔ پی ایچ ڈی اسکالر، جامعہ المصطفیٰ العالمیہ، قم۔

E-Mail: shraza2001@gmail.com

سید رضوان نقوی۔ ایم فل اسکالر، اہل بیت یونیورسٹی، تہران۔

E-Mail: rizwanaqvi14@gmail.com

غلام مرتضیٰ انصاری۔ پی ایچ ڈی اسکالر، جامعۃ المصطفیٰ العالمیہ، قم۔

E-Mail: gmansari61@gmail.com

ڈاکٹر قیصر عباس جعفری۔ اسسٹنٹ پروفیسر، (NDU)، اسلام آباد۔

E-Mail: qaisarjafri512@gmail.com

محمد حسین حافظی۔ ایم فل اسکالر، کلام اسلامی، جامعۃ المصطفیٰ العالمیہ، قم۔

E-Mail: qomihussain@gmail.com

فہرست

نمبر شمار	موضوع	مقالہ نگار	صفحہ
۱	اداریہ	مدیر	9
۲	تربیت، لغوی مفہوم و خصوصیات	محب رضا	11
۳	الٰہی صفات کے معانی کی شناخت	ڈاکٹر محمد فہیم ہاشمی	33
۴	معاشرتی ترقی میں ادب کا کردار	ڈاکٹر انصار الدین مدنی	44
۵	انسانیت، معیشت اور ماحولیات	ڈاکٹر شیخ محمد حسنین	50
۶	تکریم فاطمہ سلام اللہ علیہا	ڈاکٹر سجاد علی رئیسی	67
۷	اقوام متحدہ کا 2030 ترقیاتی ایجنڈا؛ ایک تنقیدی جائزہ	ہاشم رضا عابدی	78
۸	تعلیم و تربیت کے بنیادی اصول	سید رضوان نقوی	98
۹	بچوں کی تعلیم و تربیت میں جسمانی سزا	غلام مرتضیٰ انصاری	111
۱۰	سائنس اور دین کے درمیان رابطہ	محمد حسین حافظی	128

اداریہ

تعلیم و تربیت کا انسان سازی کے ساتھ رابطہ تسلیم شدہ ہے لیکن ہمارا المیہ یہ ہے کہ ہمارے شعبۂ تعلیم کے ارباب بست وگشاد نے اس رابطے کو دل کی گہرائیوں سے تسلیم نہیں کیا۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ ہم آج تک ایک قوم نہیں بن سکے اور رنگ و نسل اور مذہب و مسلک کی تفریق کا شکار ہیں۔ ہمارے ایک قوم نہ بن سکنے کا سبب ہماری تعلیم و تربیت میں عدمِ یکسانیت ہے۔ بدقسمتی سے ہمارے ملک میں رائج غیر متوازن تعلیمی نظاموں نے ہمیں ایک قوم بننے دیا، نہ کسی برتر تہذیب کی داغ بیل ڈالنے دی۔ تاہم "دیر آید، درست آید" کے مطابق، ہمارے ملک میں ایک قومی نصاب کی بات ہو رہی ہے اور شنید ہے کہ بہت جلد میٹرک کی سطح تک واحد تعلیمی نصاب رائج کر دیا جائے گا۔ یہ ایک خوش آئند بات ہے۔

دراصل، تعلیم و تربیت ایک ایسا مقولہ ہے جس پر مسلسل تحقیقی کام کی ضرورت ہے۔ تعلیم و تربیت کے موضوع پر ہر زاویے سے بحث کرنا اور بحث کے نتائج کو عملی میدان میں لاگو کرنا ایک پیوستہ عمل ہے جس سے گذر کر برتر قوم اور برتر تہذیب تشکیل دی جا سکتی ہے۔ لہٰذا یہ بات بھی خوش آئند ہے کہ ہماری ملت کے نوجوان طبقہ نے اس موضوع کی اہمیت کو نہ فقط تسلیم کیا ہے بلکہ وہ آج اس موضوع پر ہر زاویے سے نقد و نظر رکھتے ہیں۔ اس کی واضح دلیل مجلّہ نور معرفت کے موجودہ شمارے میں تعلیم و تربیت کے موضوع سے مربوط چھپنے والے انتہائی عمیق اور فنی مقالات کی وہ تعداد ہے جسے دیکھ کر اس شمارے کو تعلیم و تربیت کا خصوصی شمارہ کہنا بے جا نہ ہوگا۔

اس شمارہ میں "تربیت، لغوی مفہوم اور خصوصیات" کے عنوان سے ایک وزنی مقالہ شامل ہے۔ دوسرا مقالہ "معاشرتی ترقی میں ادب کا کردار" کے عنوان سے شامل ہے جو بذات خود لسانیات کا موضوع ہے جو اپنی جگہ تعلیم و تربیت کا ایک اہم شعبہ ہے۔ تعلیم و تربیت کے موضوع سے مربوط تیسرے مقالے میں "اقوام متحدہ کا 2030 ترقیاتی ایجنڈا، ایک تنقیدی جائزہ" کے عنوان سے پاکستان میں شعبۂ تعلیم و تربیت کے ارباب قدرت و اختیار کو "ہوشیار باش!" کہہ کر راہزنوں سے ہوشیار رہنے کی چارہ جوئی کی گئی ہے۔ موضوع سے مربوط چوتھے مقالے میں "تعلیم و تربیت کے بنیادی اصول" کے عنوان سے تعلیم و تربیت کی اسلامی FOUNDATIONS کو اجاگر کیا گیا ہے۔ اسی موضوع سے مربوط پانچویں مقالے میں "تعلیم و تربیت میں جسمانی سزا" کے عنوان کے تحت ایک اہم مسئلہ پر قدرے مختلف انداز سے رائے زنی کی گئی ہے۔

ان مقالات کے علاوہ، اس شمارہ کے دامن میں ایک تحقیقی مقالہ "الٰہی صفات کی معنی شناسی" کے عنوان سے مزین ہے جس میں علم الکلام کا ایک اہم موضوع زیر بحث لایا گیا ہے۔ اس مقالہ کو اس شمارہ میں شامل کرنے کا ہدف، مسلم امت کے ایمان و اعتقاد کے راکد تالاب میں ارتعاش ایجاد کرنا ہے۔ یہ مقالہ قاری کو صفات الٰہی کے برتر ادراک کی طرف گامزن کرتے ہوئے توصیف و تنزیہ کی تسبیح پر برانگیختہ کرتا ہے۔ اس شمارے میں "انسان، معیشت اور ماحولیات" کے عنوان سے ایک اور مقالہ جہاں کتاب شناسی کے باب میں ایک منفرد اندازِ بیان پر مشتمل ہے، وہاں انسان کے خلافتِ الٰہیہ کے مقام پر فائز ہونے کی حدود و قیود اور شرائط کی ترجمانی کے علاوہ معیشت اور ماحولیات کے حوالے سے قاری کو اپنا اقتصادی قرض اتارنے اور اپنا ماحولیاتی فرض ادا کرنے کے لئے تگ و دَو پر اکساتا ہے۔

نور معرفت کے زیر نظر شمارے کا ایک اور مقالہ "سائنس اور دین کے درمیان رابطہ" کے عنوان کے تحت اس سوال کا جواب فراہم کرتا ہے کہ سائنس اور دین کے درمیان پائے جانے والے رابطہ کی ماہیت کیا ہے۔ یہ مقالہ جہاں دینِ اسلام کی ہمہ گیری کی نشاندہی کرتا ہے، وہاں سائنس کے میدان میں تگ و دَو کو دینی فریضہ قرار دیتا ہے۔ اس شمارے میں "تکریم فاطمہ سلام اللہ علیہا" کے عنوان سے ایک اور مقالہ خواتینِ جنّت کی سیدہ حضرت فاطمہ الزہرا سلام اللہ علیہا کے فضائل و کرامات پر مشتمل ہے جو رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی امّت کو اجرِ رسالت کی ادائیگی کی تاکید کرنے کے ساتھ ساتھ اولادِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تکریم و تعظیم کے لزوم پر ایک جاندار تحریر ہے۔ یہ تحریر شاعر مشرق کے اُس نذرانۂ عقیدت کی یاد تازہ کرتی ہے جس میں آپ نے فرمایا:

مزرعِ تسلیم را حاصل بتول　　مادران را اسوہ کامل بتول
رشتہ آئین حق زنجیر ماست　　پاسِ فرمان جناب مصطفیٰ است
ورنہ گردِ تربتش گردیدمی　　سجدہ ہا بر خاک او پاشیدمی

ترجمہ: "تسلیم و رضا کی کھیتی کا محصول حضرت بتولؑ ہیں۔ ماوں کے لئے کامل اسوہ حضرت بتولؑ ہیں۔ اگر میرے پاوں میں آئین حق کی زنجیر نہ ہوتی اور مجھے حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے فرمان کا پاس نہ ہوتا تو میں حضرت بتولؑ کی تربت کا طواف اور آپ کی لحد پر سجدوں کی برسات کرتا۔"

ہمیں امید ہے کہ سہ ماہی علمی، تحقیقی مجلّہ نور معرفت کا یہ شمارے، تخلیقی تصنیفات کے باب میں ایک اہم اضافہ اور قارئین کرام کی علمی تشنگی دور کرنے کے لئے مئے ساقی شمار ہوگا۔ ان شاء اللہ!

* * * * *

تربیت، لغوی مفہوم اور خصوصیات

UPBRINING-LEXICAL CONNOTATION & FEATURES

Mohib Raza

***Abstract*:**

The important concept of terbiyah is lexically analysed in this article to determine its all aspects and features. Structure and meaning of this word and its usage in Quran is deeply discussed. The conclusion is understing that ultimate murab'bi of human being is Allah almighty. He has provided every prerequisite item required for the guaidence and terbiyah of the human beings in this realm and they are created with all the necessary potentials and capabilities mandatory for their growth. Terbiyah is actually provision of conducive environment for the holistic development of human being, so that his potentials can be flourished fully. Terbiyah is a general, continued, gradual and purposeful endavour. At the end 16 points related to the topic are extracted, structured in 6 different aspects, having 24 characterestics in total.

***Keywords*:** *Upbringing, Terbiyah, Holistic Development, growth.*

خلاصہ

اس مقالے میں لفظِ تربیت کے لغوی جائزہ کی روشنی میں تربیت کے مفہوم اور اس کی خصوصیات کو اجاگر کیا گیا ہے۔ نیز اس کی بناوٹ اور قرآن کریم میں استعمالات پر بحث کے ذریعے یہ واضح کیا گیا ہے کہ انسان کا حقیقی مربی صرف اللہ تعالیٰ ہے جس نے انسان کو تربیت پانے کی استعداد اور صلاحیت دے کر اس کی تربیت کے لئے ہر درکار چیز فراہم کر دی ہے۔ بنابریں، تربیت انسان کی ہمہ جہت نشو و نما کے لئے درکار ماحول کے تمام اجزاء کی فراہمی کا نام ہے۔ اس لحاظ سے تربیت، ایک عمومی، تدریجی، مسلسل اور باہدف عمل کا حامل مفہوم ہے۔ مقالہ نگار کے مطابق تربیت کے مفہوم میں ۱۶ نکات پوشیدہ ہیں جنہیں ۶ مختلف پہلوؤں سے ۲۴ خصوصیات کی شکل میں پیش کیا گیا ہے۔

کلیدی الفاظ: تربیت، لغوی مفہوم، مربی، خصوصیات، ہمہ جہت پرورش۔

نظام آفرینش میں پرورش

اللہ ربّ العزت نے نظام آفرینش میں اپنی حکمت کے تحت، تمام مخلوق کے رشد اور پرورش کا انتظام فرمایا ہے۔ دنیا کی دیگر مخلوقات کی نسبت، انسان کی ایک اہم ترین خصوصیت یہ ہے کہ وہ اپنے اعمال کی انجام دہی میں ارادہ اور اختیار کا مالک ہے۔ اختیار کی اس خصوصیت کا خاصہ یہ ہے کہ انسان اپنے رشد کو، اپنی تخلیق کے ہدف کی جانب بڑھنے کی سمت بھی دے سکتا ہے اور اس کے برخلاف بھی۔ لہٰذا، انسان اپنے رشد کے لئے رہنمائی اور ہدایت کا ضرورت مند ہے۔ پروردگار عالم انسان کی اس ضرورت کو پورا کرنے کے لئے ہر دور میں اپنے نمائندے بھیجے۔ جن کی رسالت کا اہم ترین ہدف، بنی نوع انسان کی تربیت تھا۔ قرآن کریم، رہنمائی کی وہ آخری الہامی کتاب ہے جو رہتی دنیا تک، معاشرے اور اس کے ہر فرد کی مادی اور روحانی ہدایت کے لئے نازل کی گئی ہے: "اور ہم نے آپ پر یہ کتاب ہر چیز کو بڑی وضاحت سے بیان کرنے والی اور مسلمانوں کے لئے ہدایت اور رحمت اور بشارت بنا کر نازل کی ہے۔" (16:89) انسان کی ہدایت کے لئے درکار تمام مسائل اس کتاب میں ذکر ہیں[1]۔ ہر وہ شخص جو حق کے سامنے تسلیم ہو جائے، اس کتاب سے ہدایت و رہنمائی حاصل کرنے کا سزاوار ہے۔ وہ ہدایت، جو تسلیم شدہ شخص کو اس کی پست خواہشات نفسانی سے نجات دلا کر، اس کی روحانی آزادی کے ساتھ ساتھ، اس کے رشد و کمال کا سامان مہیا کرتی ہے: "اور ہم قرآن میں سے ایسی چیز نازل کرتے ہیں جو مومنین کے لیے تو شفا اور رحمت ہے لیکن ظالموں کے لیے تو صرف خسارے میں اضافہ کرتی ہے۔" (18:82) انسان کی یہی روحانی آزادی، اسے انسانیت کے بالاتر اور عالی تر روحانی مقامات پر فائز کرکے، معاشرے کی حقیقی فلاح کا موجب بناتی ہے۔[2]

تمام انبیاء انسانیت تک حق اور ہدایت کا یہی پیغام پہنچاتے رہے ہیں اور ایسے افراد آمادہ و تیار کرنے کی مسلسل کوششوں میں رہے ہیں کہ جو ایک مطلوبہ الٰہی معاشرہ تشکیل دینے میں ان کی مدد کر سکیں۔ اس لحاظ سے فردسازی اور معاشرہ سازی کا یہ عمل، درحقیقت انبیاء علیہم السلام کا اصلی کام ہے۔ فی زمانہ، ہدایت حاصل کرنے اور انسانی کرامت و شرافت کے ان بالا مقامات پر پہنچنے کے اس انسان ساز عمل کو تربیت کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ اس مقالہ میں تربیت کے اسی اہم موضوع پر ایک مختصر بحث کی گئی ہے کہ لفظ تربیت کا لغوی مفہوم کیا ہے اور اس لغوی مفہوم کی رو سے تربیت کتنے مختلف پہلوؤں اور خصوصیات کی حامل ہے؟ بحث کے آغاز میں دو مقدمے پیش خدمت ہیں تاکہ ان کی روشنی میں اصل موضوع کے بارے میں چند گزارشات پیش کی جا سکیں:

پہلا مقدمہ یہ کہ، اگر اس دنیا کی مخلوقات کی گروہ بندی کی جائے تو بنیادی طور پر انہیں جاندار اور بے جان، دو طبقوں میں بانٹا جا سکتا ہے۔ بے جان طبقہ میں جمادات، جبکہ جاندار طبقہ میں نباتات، حیوانات اور انسان نامی تین گروہ بنتے ہیں۔[3]

پہلے طبقے میں، مٹی اور پتھر وغیرہ جیسی بے جان اشیاء شامل ہیں۔ یہ اشیاء کچھ ذاتی خصوصیات کی حامل ہوتی ہیں۔ ان ذاتی خاصیتوں کو ظاہر کرنے کے لئے عموماً" طبع" یا" طبیعت" کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے۔[4] مثلاً جب ہم پانی نامی ایک بے جان موجود کے خواص میں سے کوئی خاصیت بیان کرنا چاہیں، تو کہتے ہیں کہ پانی کی طبیعت ایسی ہے یا مثلاً کہتے ہیں کہ لکڑی کی طبیعت یا "خاصیت" ایسی ہے کہ سلگنے یا جلنے کے قابل ہے۔ اس طرح ہم مختلف عناصر اور اشیاء کے حوالے سے، ان کے لئے مختلف ذاتی خصوصیات کے قائل ہوتے ہیں۔ ان خاصیتوں کے علاوہ، ان اشیاء میں اپنے آپ کو بنانے یا بڑھانے کا کوئی عملی مشاہدہ نہیں کیا جاتا، یہ اشیاء خارجی عوامل کے تحتِ تاثیر ہوتی ہیں اور خود سے خارج میں کوئی نقش یا تاثر پیدا کرنے کے قابل نہیں ہوتیں۔

دوسرا طبقہ جانداروں کا ہے،اور اس طبقے کے تین گروہوں میں سے پہلا گروہ نباتات کا ہے۔ نباتات کے اندر، ذاتی خاصیتوں کے علاوہ ایسی قوتیں بھی ہوتی ہیں جو زمین اور فضا سے مادہ کو جذب کرنے کی صلاحیت رکھتی ہیں۔ بنابراین نباتات، رشد کرنے اور اپنی بقا کو ادامہ دینے کی صلاحیتیں رکھ پاتے ہیں، البتہ یہ صلاحیتیں ان کے اندر طبعی طور پر ودیعت کردہ ہوتی ہے اور مختلف طریقوں اور شکلوں میں ظہور پذیر ہوتی ہیں۔ لہٰذا کسی نباتات کا ایک بیج، نشوونما کے موزوں عوامل مل جانے کی صورت، ایک خاص انداز میں اپنا سفر شروع کردیتا ہے اور اگر اس دوران، نشوونما کے تمام عوامل میسر اور ہلاکت کے عوامل منفی ہوں تو یہ بیج رشد کرتے اپنے سفر کے اختتام کو پہنچ جاتا ہے۔

اس طبقہ کا دوسرا گروہ حیوانات کا ہے، حیوانات کے اندر، رشد اور تولیدِ مثل کی خاصیتوں اور صلاحیتوں کے علاوہ، حس کرنے کی قوتیں اور نیم آگاہانہ یا نیم شعوری حالت یا رجحان بھی پائے جاتے ہیں کہ جن کی مدد سے وہ آفات کے مقابل اپنی بقا، رشد اور تولید مثل کے وسیلے فراہم کرتے ہیں، اس حالت کو غریزے یا جبلت کا نام دیا جاتا ہے۔ حیوانات کی یہ کچھ خاص اندرونی خصوصیات، جو ان کی زندگی کی رہنما ہوتی ہیں، کسبی نہیں ہوتیں، یعنی حیوانات کے لئے ان کو سیکھنے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ مثال کے طور پر ایک اڑنے والے پرندے یا پانی میں رہنے والے جانور کا بچہ اپنی پیدائش کے آغاز میں ہی بغیر کسی کے سکھائے اور بغیر کسی امداد کے، ایسے کام کرنے لگتا ہے کہ جو اس کی اپنی نوع سے متناسب اور زندگی کی بقا کے لئے ضروری ہوتے ہیں۔

لفظ طبیعت کو ہم بے جان موجودات کے علاوہ جانداروں کے لئے بھی استعمال کرتے ہیں، مثلاً پودوں، حیوانوں اور انسانوں کے لئے بھی۔ تاہم ان پہلوؤں کے لئے کہ جن میں وہ "غیر جانداروں" کے ساتھ مشترک ہیں کیونکہ بے جانوں میں جو خصوصیات ہیں وہ جانداروں میں بھی ہیں، لیکن جو ذاتی خصوصیات جانداروں کی ہیں، وہ بے جانوں میں نہیں پائی جاتیں۔

جانداروں کے طبقے کا تیسرا گروہ، انسان، ان سب خاصیتوں اور قوتوں کے ساتھ ساتھ ، اپنی فطرت اور سرشت میں جبلت سے بالاتر ایک آگاہانہ چیز رکھتا ہے۔ انسان جو کچھ جانتا ہے وہ اپنے اس جاننے کے بارے میں آگاہی حاصل کر سکتا ہے یعنی انسان کچھ "فطریات" کا حامل ہے اور یہ جانتا ہے کہ اس میں کچھ فطریات ہیں۔ فطریات کا "غریزے" یا" جبلت "سے ایک اور فرق یہ ہے کہ غریزے کا تعلق فقط مادی زندگی سے ہے جبکہ انسان کی "فطریات" ایسے امور سے مربوط ہے جنہیں ہم امور استثنائی کہتے ہیں یعنی حیوانی امور سے ہٹ کر جو خالصتاً انسانی یا روحانی امور ہیں۔ پس انسان، حیوانات سے دو لحاظ میں فرق کرتا ہے، ایک یہ کہ اس کے رجحانات اور میلانات روحانی پہلو کے حامل بھی ہوتے ہیں، دوسرے یہ کہ انسان عقل اور ارادہ کی قوت رکھتا ہے۔ عقل اور ارادہ کی یہ قوتیں، ان رجحانات کو افراط اور تفریط سے بچا کر، انسان کے افعال کو، اختیاراً، اس کے ہدف کے سمت حرکت دینے کے قابل بناتی ہیں۔

پس، اگر اس دنیا میں موجود مختلف مخلوقات کا مشاہدہ کریں تو یہ بات سامنے آتی ہے کہ انسان کے علاوہ دیگر تمام مخلوقات کو اپنے سفر حیات میں آگے بڑھنے کے لئے جو لوازمات درکار ہوتے ہیں وہ پروردگار کی جانب سے طبیعتاً یا جبلتاً ان کی سرشت میں رکھ دیئے گئے ہیں، اور یہ مخلوقات، اپنی جنس سے متناسب ضروری اعمال، بغیر کسی کے سکھائے انجام دینے کے قابل ہوتی ہیں۔ ان تمام مخلوقات میں فقط انسان وہ مخلوق ہے کہ جو ایسی قوتیں اور صلاحیتیں رکھتا ہے، کہ جن کو پروان چڑھانے کے لئے کسی اندرونی اور بیرونی ہدایت و رہنمائی کی لازمی ضرورت ہوتی ہے۔

دوسرا مقدمہ یہ ہے کہ، قرآن کریم نے متعدد مقامات پر اس حقیقت کا ذکر کیا ہے اور بحیثیت مسلمان ہم اس بات کے قائل ہیں کہ اس جہان فانی کی تنہا خالق اللہ تعالیٰ کی ذات اقدس ہے۔" جس کے لیے آسمانوں اور زمین کی بادشاہی ہے اور جس نے کسی کو بیٹا نہیں بنایا اور جس کی بادشاہی میں کوئی شریک نہیں ہے اور جس نے ہر چیز کو خلق فرمایا پھر ہر ایک کو اپنے اندازے میں مقدر فرمایا" (2:25) خداوند کریم کی ذات، وہ تنہا حقیقت ہے کہ جس

کے ساتھ نسبت کی وجہ سے اس کائنات میں ہر چیز کا وجود قائم اور قدر و قیمت برقرار ہے۔ خالق قدوس نے اس دنیا کی کوئی شیٔ عبث یا ناقص خلق نہیں فرمائی ہے۔ سورہ التین کی آیت نمبر ۴ میں ارشاد باری تعالیٰ ہے کہ لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنسَانَ فِي أَحْسَنِ تَقْوِيم۔ ترجمہ: "بتحقیق ہم نے انسان کو بہترین اعتدال میں پیدا کیا۔" (4:95)، نیز ارشاد باری تعالیٰ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو فطرت الٰہی پر خلق کیا ہے۔(30:30) انسان نے اس دنیا میں اپنا سفر طے کر کے واپس بارگاہ حق میں پلٹ جانا ہے۔(2:156) یہاں وضاحت کے ساتھ اس امر کی نشاندہی کر دی گئی ہے کہ انسان کو اللہ تعالیٰ کی جانب سے ایک مقصد کے تحت، تمام لوازمات اور ضروریات کے ہمراہ، اس دنیا میں کچھ عرصہ گزارنے کے لئے بھیجا گیا ہے۔ البتہ اگلے جہان میں منتقل ہونے سے قبل، بتائے گئے طریقہ کار کے مطابق اپنی ذمہ داریوں کی ادائیگی، اس دنیا میں نجات اور آنے والی دنیا میں سعادت کے حصول کا پیش خیمہ قرار دی گئی ہے: " جو لوگ ایمان لائے اور نیک اعمال انجام دیے ان کی نیک نصیبی ہے اور ان کے لیے بہترین ٹھکانا ہے" (13:29)

قرآن کریم کے مطابق انسان کی خلقت کی ابتدا مٹی(32:7) اور نطفہ(16:4) سے ہوئی اور خالق عالم نے اس میں اپنی روح پھونکی ہے۔(15:29) خداوند عالم نے انسان کو جسمانی اعتبار سے تخلیق کے مختلف مراحل سے گزارتے ہوئے (22:5) اس کو ارادہ، اختیار، عقل اور خلاقیت جیسی صفات سے بھی نوازا۔ نیز انسان کو زمین پر اپنا خلیفہ قرار دیتے ہوئے(2:30) اس دنیا میں ہر وہ چیز بھی خلق فرمادی جو اس کو یہ دنیاوی سفر طے کرنے کے لئے درکار تھی۔ انسان کی مادی ضروریات مہیا کرنے کے ساتھ ساتھ خداوند کریم نے انسان کی روحانی ضروریات پورا کرنے کا بندوبست بھی فرمایا: "اے لوگو! تمہارے پروردگار کی طرف سے (یہ قرآن) تمہارے پاس نصیحت اور تمہارے دلوں کی بیماری کے لیے شفا اور مومنین کے لیے ہدایت اور رحمت بن کر آیا ہے" (10:57) تاکہ انسان اپنی خلقت کے مقصد کو حاصل کرنے کے لئے کسی بھی لحاظ سے کسی انحراف کا شکار نہ ہو۔"اور میں نے جن و انس کو خلق نہیں کیا مگر یہ کہ وہ میری عبادت کریں" (51:56)۔ انسان کی ضروریات پورا کرنے کے اس بندوبست کو ہم ہدایت کے نام سے پہچانتے ہیں، جس کے لئے اللہ تعالیٰ نے ہر انسان کو عقل و شعور عطا کرنے کے ساتھ ساتھ وحی، پیامبران اور الٰہی کتب کا وسیلہ بھی فراہم کیا۔ پس انسان، اللہ رب العزت کی ایک با استعداد اور باہدف تخلیق ہے، جو اپنے ارادہ کے ساتھ اپنی زندگی کے سفر کا راستہ متعین کرنے کا اختیار رکھتا ہے، جبکہ خداوند کریم نے اس کی ہدایت کے تمام ممکنہ لوازمات بھی فراہم فرما دیئے ہیں۔ اس لحاظ سے انسان اس قابل ہے کہ اپنی صلاحیتوں اور استعدادوں کو درست سمت میں پروان چڑھا کر خداوند متعال کا قرب حاصل کر لے یا بصورت دیگر، ذلت اور گمراہی کی پستیوں میں گم ہو جائے۔

مندرجہ بالا دو مقدموں سے یہ نتیجہ اخذ کیا جاسکتا ہے کہ ہدایت یا رہنمائی کی ایک شکل وہ اندرونی استعداد ہے جو خداوند کریم نے انسان کے علاوہ دیگر مخلوقات کو ودیعت فرمائی ہے۔ یہ مخلوقات اس طبیعی ہدایت کے ساتھ خلق ہوئی ہیں، جو خلقت کے آغاز سے لے کر ان کے کامل ہونے تک، ہر قدم پر ان کی رہنمائی کرتی ہے۔ جیسے نباتات اور حیوانات اپنی حیات کے متعینہ ہدف تک بغیر کچھ جانے یا سیکھے، بڑھتے چلے جاتے ہیں۔ اس طرح یہ استعداد، ان مخلوقات کی سعادت کی ضامن قرار پاتی ہے۔ ہدایت کی ایک دوسری شکل وہ استعداد ہے جو انسان کو اشرف المخلوقات ہونے کے عنوان سے عطا کی گئی ہے۔ انسان اپنے ارادہ اور اختیار کے ساتھ، ہدایت پانے کی اس اندرونی استعداد کی نشو و نما کا ذمہ دار ہے، جبکہ اس ذمہ داری کی درست بجاآوری کے لئے اللہ تعالیٰ نے ہدایت کے بیرونی وسیلے بھی فراہم کر دیئے ہیں۔ پس، ہدایت پانے اور رشد کرنے کے عنوان سے تربیت کا اصل موضوع انسان کی ذات ہے جو اپنی خلقت کے اعتبار سے تربیت پانے کی صلاحیت کا حامل بھی ہے اور اس کی شدید نیاز بھی رکھتا ہے۔ لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یہ تربیت کس مفہوم کی حامل ہے؟ اور کتنے مختلف پہلوؤں کو اپنے اندر سموئے ہوئے ہے؟ اس مقالہ میں انہی سوالات کے سیاق میں، لفظِ تربیت کا مختلف پہلوؤں سے لغوی جائزہ لیا گیا ہے۔ لہٰذا خود مفہوم کی اہمیت سے ہی اپنی بحث کا آغاز کرتے ہیں۔

مفہوم شناسی کی اہمیت

اللہ تعالیٰ نے دیگر مخلوقات کی نسبت، انسان کو اپنی بات بیان کرنے اور دوسروں کی بات سمجھنے کی خصوصی صلاحیت دی ہے۔ آغاز بشریت سے ہی چیزوں اور مفاہیم کے نام رکھنے اور اس طریقے سے اپنی فکر، سوچ اور تجربہ دوسروں تک منتقل کرنے کا سلسلہ جاری رہا ہے۔ آج کی دنیا میں بولی جانے والی مختلف زبانیں اسی سلسلے کی ایک لڑی ہیں۔ مختلف زبانوں میں، اشیاء اور مفاہیم کو بیان کرنے کے لئے مختلف الفاظ کا سہارا لیا جاتا ہے۔ یہ الفاظ، دنیا کے مادی موجودات کو بیان کرنے، نیز انسانی ذہن میں موجود ذہنی نقوش اور مفاہیم کو دوسرے اذہان تک منتقل کرنے کے لئے وضع کیے گئے۔ مختلف وجوہات کی بنا پر اس بات کا امکان رہتا ہے کہ الفاظ جس معنی کے لئے وضع کئے گئے ہوں، اس معنی یا مفہوم کو درست انداز یا مکمل طور پر منتقل نہ کر پائیں۔ اس لئے لازم ہے کہ کسی بھی موضوع کو سمجھنے اور اسے صحیح طور پر درک کرنے کے لئے، اس کو بیان کرنے والے لفظ کے درست معنی اور مفہوم مکمل طور پر واضح ہوں۔ خاص طور پر، اس بات کی ضرورت اور اہمیت اس وقت اور بھی زیادہ ہو جاتی ہے، جب کسی مفہوم کو بیان کرنے والا لفظ، جس زبان میں وضع کیا گیا تھا، اس زبان سے منتقل ہو کر کسی اور زبان میں مستعمل ہو جائے۔

'تربیت' کا لفظ اسی نوعیت کا ہے کہ جو عربی زبان میں ایک خاص مفہوم کا حامل ہے۔ عربی زبان کا یہ لفظ آج کل، فارسی اور اردو، دونوں زبانوں میں رائج ہے۔ اردو زبان میں عموماً اس لفظ سے کسی فرد کے دینی اور اخلاقی پہلو کی رشد اور پرورش مراد لی جاتی ہے۔ تربیت کو اکثراً تعلیم کے ساتھ عطف کرکے استعمال کیا جاتا ہے اور اس ترکیب میں تعلیم، ایک فرد کی فکر اور معلومات، جبکہ تربیت، اس فرد کی تہذیب اور اخلاق کو پروان چڑھانے کی ذمہ دار سمجھی جاتی ہے۔ اس لحاظ سے تعلیم اور تربیت ایک ہی سطح پر ہوتے ہوئے، مل کر کسی فرد کی شخصیت کو بنانے کا مفہوم دیتے ہیں۔ مفہوم کی اس نوعیت میں، اس بات کا امکان ہے کہ تعلیم اور تربیت کے عملی دائرہ کار ایک دوسرے سے جدا ہوں اور یہ دونوں عمل الگ الگ بھی انجام پا سکتے ہوں، نیز ان دونوں موضوعات کے اپنے اپنے جدا اہداف رکھنا بھی ممکن ہو۔ نتیجتاً، کسی فرد کی تعلیم کا تربیت سے علیحدہ انتظام اور تربیت کا تعلیم سے کوئی سروکار نہ ہونے کا امکان بھی پیدا ہو جاتا ہے۔ پس، تربیت کا مفہوم بہتر اور کلی انداز میں سمجھنا لازم ہے اور اس کے لئے ابتداً، تربیت کے مختلف لغوی معانی زیر بحث لانا ضروری ہیں، تاکہ اس لفظ کے مختلف پہلو اور خصوصیات واضح ہو جائیں۔

تربیت، عربی لغت میں

عربی لغت میں تربیت کے معنی جاننے کے لئے ضروری ہے کہ پہلے اس لفظ کی بناوٹ کا جائزہ لیا جائے۔ جبکہ لفظ تربیت کی بناوٹ کو سمجھنے کے لئے ان دو نکات پر توجہ لازم ہے:

پہلا نکتہ، یہ ہے کہ عربی زبان کے قواعد کو دیکھا جائے تو اس زبان میں ایک لفظ کو مختلف صورتوں (صیغوں) میں ڈھالا جاتا ہے تاکہ اس لفظ سے مختلف معانی حاصل کئے جا سکیں۔ **دوسرا نکتہ**، عربی زبان کی ایک اور اہم خاصیت یہ ہے کہ ایک لفظ کو مختلف قالبوں میں ڈھال کر، اس لفظ کے معنی میں اس قالب کی مناسبت سے مزید معانی کا اضافہ کر دیتی ہے۔ اصطلاحی زبان میں ان قالبوں کو "باب" کہتے ہیں۔ مثال کے طور پر اصلی حروف "س ل م" سے لفظ "سلم"، اسی طرح کے ایک باب، بنام باب تفعیل میں جا کر "تسلیم" بن جاتا ہے اور اس طرح اس باب کا مصدر بن کر اس باب کی بناوٹ اور معانی کا حامل ہو جاتا ہے۔ باب تفعیل ایک لفظ میں ۷ طرح کے مختلف معنی اضافہ کر سکتا ہے۔ مثال کے طور پر باب تفعیل کی بناوٹ کا حامل ہو کر لفظ کے معنی میں تدریج کا مفہوم شامل ہو سکتا ہے۔ اس کے علاوہ باب تفعیل کے معنوں میں کثرت، پھیلاؤ اور زیادتی کے مفاہیم بھی شامل ہیں۔[5] لہٰذا، اگر لفظِ تربیت کا عربی لغت میں جائزہ لینا چاہیں تو اولاً یہ دیکھنا ہوگا کہ اس لفظ کے اصلی حروف اور ان کے معنی کیا ہیں، اور ثانیاً اس بات کا تعین کرنا ہوگا کہ یہ لفظ کس باب میں منتقل ہو کر کس بناوٹ اور معنی کا حامل ہوا ہے۔ ان دو مراحل سے گزر کر تربیت کے لغوی معنی کے بارے میں ایک رائے قائم کی جاسکے گی۔

مذکورہ بالا نکات کی روشنی میں عرب زبان کے ماہرین میں اس بات پر کوئی اختلاف نہیں کہ عربی زبان میں تربیت کا لفظ، باب تفعیل کا مصدر ہے[6] اور اس کے معنوں میں زیادہ ہونے اور تدریج کا مطلب پایا جاتا ہے۔ لیکن لفظ تربیت، باب تفعیل میں آنے سے پہلے کن اصلی حروف (Roots) کا حامل تھا، اس بارے میں کچھ لغت شناسوں کا کہنا ہے کہ اس کے اصلی حروف ۲[7] اور کچھ ماہرین کے مطابق ۳[8] ہیں۔ ماہرین کے ایک طبقہ کی رائے کے مطابق تربیت کے اصلی حروف "ر ب و" جبکہ دوسرے طبقہ کی رائے کے مطابق اصلی حروف "ر ب ب" ہیں۔[9] ذیل میں ہم ان دونوں Roots کے مطابق تربیت کے مفہوم کو سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔

"ر ب وؔ" کے لغوی معنی

لغت میں "ر ب و"، بڑھوتری، زیادتی، رشد، نشو و نما یا افزائش کے معنی میں آیا ہے[10]، جیسے معجم مقائیس اللغۃ میں یوں لکھا ہے": الراء و الباء الحرف المعتل و کذلك المهموز منه، يدل على اصل وحد و هو الزيادة و النماء و العلو" [11] یعنی ربو، ربی، اور رباً، تمام الفاظ، زیادتی، بلندی یا رشد کے معنی میں استعمال ہوتے ہیں۔ اسی طرح مفردات قرآن[12]، مجمع البحرین [13] اور لغت لسان العرب [14] میں بھی یہی معنی ذکر ہوا ہے۔ اگر جناب راغب اصفہانی کی مفردات القرآن میں اصلی حروف "ر ب و" کے ذیل میں دیکھیں تو "رَبوَۃ" یا "رَبَاوَۃ"، بلند جگہ یا "ٹیلہ" کو کہتے ہیں، جیسے قرآن کریم میں ارشاد ہے، "آوَيْنَاهُمَا إِلَى رَبْوَةٍ ذَاتِ قَرَارٍ وَ مَعِينٍ" ترجمہ: "انہیں ہم نے ایک بلند مقام پر جگہ دی جہاں اطمینان تھا اور چشمے پھوٹتے تھے۔" (23:50)۔

انہی اصلی حروف سے لفظ "ربَا" ہے جس کے معنی بڑھنے اور بلند ہونے کے ہیں، جیسے ارشاد باری تعالیٰ ہے: "فَإِذَا أَنزَلْنَا عَلَيْهَا الْمَاءَ اهْتَزَّتْ وَ رَبَتْ" ترجمہ: "جب ہم اس پر پانی برساتے ہیں تو یہ جنبش میں آ جاتی ہے اور ابھرنے لگتی ہے۔" (22:5)۔ اصل سرمایہ پر زیادتی کو بھی "ربا" کہا جاتا ہے۔ اسی طرح ایک اور لفظ "الربو"، سانس پھولنے یا چڑھنے کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ جبکہ ایک لفظ "اربی" ہے جس کا مطلب کسی پر بلند یا نگران ہونا ہے۔ نیز انہی اصلی حروف سے ایک لفظ "ربیت" تربیت کے معنی میں استعمال ہوتا ہے جیسے "رَبَيْتُ الوَلَدَ فَرَبَا" یعنی میں نے بچے کی تربیت کی چنانچہ وہ بڑھ گیا۔" خلاصہ یہ کہ "ر ب و" کے اصلی حروف چار معانی کے لئے استعمال کیے جاتے ہیں: ۱) زیادتی، بڑھوتری؛ ۲) بلندی؛ ۳) کسی چیز کی افزائش یا مادی رشد ۴) کمیت میں زیادتی۔

" ر ب ب" کے لغوی معنی

" ر ب ب " بہت سارے معانی رکھتا ہے، جیسے زیر نگرانی اور زیر سرپرستی پرورش[15]، حفاظت، توجہ اور سرپرستی[16]، کسی چیز کی اصلاح کی ذمہ داری اور اس کی انجام دہی کی تدبیر[17] یا کسی چیز کی ایجاد اور اس کو بتدریج کامل کرنا[18]، کسی چیز کو تمام اور کامل کرنا، کسی چیز کو اس کے کمال کی طرف لے جانا اور اس کے نقائص و کمی کو دور کرنا یا ادب سکھانا۔[19]

" ر ب ب" یا " ربّ"، لغت میں خالقیت، مالک، رئیس، مربی اور مدبر کے معنی میں بھی آیا ہے۔[20] جناب مرتضٰی زبیدی اس بارے میں یوں رقم طراز ہیں: " فالرب، المالك و الخالق و الصاحب و الرب المصلح للشئی " [21] یعنی: "ربّ یعنی مالک، خالق، صاحب یا کسی چیز کا اصلاح کرنے والا۔" جبکہ لغت لسان العرب کے موَلف، جناب ابن منظور لکھتے ہیں کہ " : الرب یطلق فی اللغة علی المالك و السید و المدبر و المربی۔۔۔ " [22] یعنی: "لغت میں رب مالک، سردار، مدبر، پالنے والا وغیرہ کے معنی میں آیا ہے۔۔۔"

جناب راغب اصفہانی، مفردات القرآن میں اصلی حروف " ر ب ب " کے ذیل میں ذکر کرتے ہیں کہ الرَّبُّ کے اصل معنی " تربیت کرنا " یعنی کسی چیز کو تدریجاً نشو و نما دیکر حد کمال تک پہنچانے کے ہیں، یعنی کسی چیز کو یکے بعد دیگرے ایک حالت سے دوسری حالت میں اس طرح نشو نما دیتے رہنا کہ وہ اپنے حد کمال تک پہنچ جائے۔ ان کے بقول، رَبٌّ کا لفظ اصل میں مصدر ہے اور استعارتاً فاعل کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔[23]

لفظ " ربّ" کی خاصیت یہ ہے کہ یہ لفظ، صرف اللہ تعالیٰ کے لئے مختص ہے۔ اگر یہ لفظ "اضافت" یا "لام تعریف" کے بغیر ہو تو سوائے اللہ تعالیٰ کے، کہ جو جملہ موجودات کے مصالح کا واحد کفیل ہے، کسی پر اس کا اطلاق نہیں ہوتا جیسے قرآن کریم میں ارشاد ہے، " بَلۡدَةٌ طَيِّبَةٌ وَ رَبٌّ غَفُور "۔ ترجمہ: " ایک پاکیزہ شہر (ہے) اور بڑا بخشنے والا پروردگار " (34:15) جبکہ اضافت کے ساتھ اللہ تعالیٰ کے لئے بھی استعمال کیا جاسکتا ہے جیسے قرآن کریم میں ذکر ہے، " الۡحَمۡدُ لِلّٰهِ رَبِّ الۡعَلَمِين " ترجمہ: " ثنائے کامل اللہ کے لیے ہے جو سارے جہان کا پروردگار ہے " (1:2)، اور اللہ تعالیٰ کے علاوہ دیگران کے لئے بھی، جیسے " فَأَنۡسَىٰهُ الشَّيۡطَٰنُ ذِكۡرَ رَبِّهِ " ترجمہ: " مگر شیطان نے اسے بھلا دیا کہ وہ اپنے مالک سے یوسف کا ذکر کرے " (42:12) ، یا جیسے " رَبُّ الفَرَسِ " یعنی گھوڑے کا مالک۔ ان اصلی حروف کا ایک اور لفظ " ربّانی " ہے، جس کو " ربّان " (صفت) یا " ربّ " (مصدر) کی طرف منسوب کیا جاتا ہے۔ اگر صفت کی طرف نسبت دیں تو ربانی وہ ہے جو علم کی پرورش کرے، جیسے حکیم وہ ہے جو حکمت کو فروغ

دے۔ اور اگر مصدر کی طرف منسوب کریں تو ربانی کا مطلب وہ فرد ہے جو علم سے اپنی پرورش کرے۔ درحقیقت یہ دونوں معنی متلازم ہیں کہ جو بھی علم کی پرورش کرے گا، وہ اس کے ذریعے اپنی تربیت کرے گا اور جو اپنی ذات کی تربیت کرے گا وہ علم کو بھی فروغ بخشے گا۔

ایک اور لفظ "رابۃ" ہے، یعنی وہ بیوی جو اپنے پہلے شوہر سے پیدہ شدہ اولاد کی تربیت کر رہی ہو جبکہ "ربیب" یا "ربیبۃ" وہ اولاد ہے جو پہلے شوہر سے ہو اور دوسرے شوہر کے زیر تربیت ہو یا پہلی بیوی سے ہو اور دوسری بیوی کی آغوش میں تربیت پا رہی ہو۔ اس کے علاوہ ایک اور لفظ "الرباب" ہے جو بادل کو کہتے ہیں، کیونکہ وہ بارش برسا کر نباتات کی پرورش کرتا ہے اور انہیں بڑھاتا ہے۔ خلاصہ یہ کہ "ر ب ب" کے اصلی حروف درج ذیل معانی کے لیے استعمال کیے جاتے ہیں:

۱۔ زیر نگرانی یا زیر سرپرستی پرورش

۲۔ حفاظت و توجہ

۳۔ کسی چیز کی اصلاح و تدبیر

۴۔ کسی چیز کی ایجاد اور اسے کامل کرنا

۵۔ مالک و مدبر

۶۔ تربیت کرنا

۷۔ تربیت اور پرورش کرنے والا، مربی یا استاد

۸۔ تربیت اور پرورش پانے والا، متربی یا شاگرد

تربیت، اردو، فارسی اور انگریزی لغت میں

اردو لغت بورڈ، کراچی کی ترتیب کردہ اردو لغت کے مطابق تربیت کے معنی تعلیم، تادیب، اخلاق و تہذیب کی تعلیم، سکھانا، سدھانا، پروان چڑھانا اور پرورش بیان ہوئے ہیں[24]۔ جبکہ فیروز اللغات جامع میں تربیت سے مراد پرورش، پالنا، تعلیم و تہذیب اور تعلیمِ اخلاق ہے۔[25] فارسی فرہنگ معین میں تربیت کے معنی پرورش کرنا اور ادب و اخلاق سکھانا ذکر ہوئے ہیں۔[26] لغت نامہ دہخدا میں تربیت، پرورش، تادیب، تغذیہ اور تہذیب کے معنی میں آئی ہے۔[27] جبکہ فرہنگ عمید میں تربیت کے معنی پرورش کرنے اور کسی کو ادب و اخلاق سکھانے کے معنی میں ذکر ہوئے ہیں۔[28] انگریزی زبان میں تربیت کے مترادف کے لئے لفظ "Education" سے استفادہ کیا جاتا ہے۔[29] اس کلمہ کا بنیادی لاطینی ریشہ 'dux' یا 'ducis' ہے، جس کے معنی رہبر اور رئیس کے ہیں۔ ایجوکیشن کا لفظ، خود دو (۲)

لاطینی الفاظ سے مشتق ہے، ایک Educare (ایدوکارے) اور دوسرے Educere (ایدوچارے) [30] Educare، حیوان اور انسان دونوں کے بارے استعمال کیا جاتا ہے، اور اس کے معنی پروان چڑھانے اور شکل و صورت دینے کے ہیں۔ جبکہ Educere کے معنی پرورش کرنے اور انسان کی بالقوہ توانائیوں کو عملی کرنے کے ہیں۔[31] اس لحاظ سے لفظ "ایجو کیشن" کے معنی میں جسمانی اور روحانی، دونوں عناصر کی پرورش پوشیدہ ہے، لیکن فی زمانہ "ایجو کیشن" کے لفظ کو صرف علوم وفنون کے انتقال کے معنی میں ہی استعمال کیا جاتا ہے۔[32]

تربیت، قرآن کریم میں

خود لفظ تربیت، باب تفعیل کے مصدر کے عنوان سے قرآن میں نہیں آیا ہے،[33] لیکن "ر ب ب" اور "ر ب و" کے دیگر مشتقات، آیاتِ قرآن میں فراوان ذکر ہوئے ہیں۔[34] جیسے ربی، ربنا، ربہ، ربانییّن، ربانیّون، ربّیون، ربائب، ربھا، ربکم۔[35] ان دو ریشوں (اصلی حروف) میں سے اصلی حروف "ر ب ب" کے مشتقات، "ر ب و" کے مشتقات سے کہیں زیادہ استعمال ہوئے ہیں۔[36] اصلی حروف "ر ب و" کے مشتقات غیر از انسان، مادی چیزوں کی کثرت اور زیادتی کے لئے زیادہ استعمال ہوئے ہیں۔

انسان کے بارے میں اصلی حروف "ر ب و" کے مشتقات، قرآن کریم کی ۲ آیات میں استعمال ہوئے ہیں[37]، اور وہ مشتقات رَبَّيَانِي (17:24) اور نُرَبِّكَ (26:18) ہیں۔ ان دو آیات میں سے پہلی آیت پر دقت کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اولاً، یہ مشتق انسان کی عمر کے ابتدائی بچپن کے دور کے لئے استعمال ہوا ہے اور ثانیاً، اس مشتق کا استعمال غالباً رشد جسمانی اور ظاہری نشو و نما کے لئے ہوا ہے[38]، البتہ چند محققین اس بات کے بھی قائل ہیں کہ اس معنی میں غیر جسمانی پرورش بھی شامل ہے، کیونکہ والدین بچے کی ہر قسم کی تربیت کے ذمہ دار ہوتے ہیں۔ جبکہ دوسری آیت میں فرعون کے ذریعے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی پرورش کا تذکرہ ہے۔ اگرچہ اس بات کا امکان نہیں ہے کہ فرعون نے آپ کی روحانی پرورش کا کوئی اہتمام کیا ہو، لیکن جناب موسیٰ علیہ السلام کی پرورش میں فرعون کے ہمراہ جناب آسیہ (ع) کی شمولیت بھی تھی، اور آیت شریفہ میں صیغہ بھی جمع کا استعمال کیا گیا ہے، اس لیے یہ احتمال دیا جا سکتا ہے کہ یہاں بھی ہر دو، جسمانی اور غیر جسمانی پرورش مراد ہو۔

یہاں پر ایک نکتہ یہ بھی ہے کہ ہر چیز میں زیادتی اس کی جنس کی مناسبت سے ہوتی ہے۔ اسی لئے مال کی زیادتی کمیت کے لحاظ سے ہے، لیکن انسان کے بارے میں کہہ سکتے ہیں کہ جسم کے رشد اور پرورش کے ساتھ ساتھ، انسان کی روحانی قوتوں، باطنی استعدادوں اور توانائیوں کا رشد بھی مقصود ہے، اس لحاظ سے والدین کے تربیت کرنے سے بچہ کی ذات کے ہر پہلو کی پرورش مراد ہے۔ لہٰذا یہ کہا جا سکتا ہے کہ اگر لفظِ تربیت، اصلی حروف 'ر ب

و' سے ہی اشتقاق یافتہ ہو تو اس کا مفہوم صرف جسمانی تربیت نہیں بلکہ اس سے، انسان کی نسبت، اس کے تمام جسمانی و روحانی پہلوؤں کی افزائش و رشد مراد ہے، پس اس کا معنی عام ہوگا اور انسان کی ذات کے تمام پہلوؤں کی پرورش کو شامل کرے گا۔

اصلی حروف 'ر ب ب' سے کلمہ 'ربّ'، خداوند کریم کی صفت ربوبیت کے حوالے سے قرآن مجید میں کثرت سے استعمال ہوا ہے، اکثر مترجمین قرآن نے سورہ الحمد میں ربّ کے معنی، اللہ تعالیٰ کی صفت کے طور پر، 'پالنے والے' کے ہی کیے ہیں[39]۔ اصلی حروف 'ر ب ب' کے مشتقات میں سے ربانییّن (3:79) یا ربانیّون (5:63) ربّیون (3:146) اور ربائب (4:23) وہ مشتقات ہیں[40] جو انسان کے بارے میں ۵ مختلف آیات میں استعمال ہوئے ہیں۔ "ربانیین"، "ربّانی" کی جمع ہے۔ یہاں پر ربانی کے دو مطلب ہو سکتے ہیں، یا ربانی وصف ہے اور اس کے معنی تربیت کرنے والے یا مربی کے ہیں، یا ربانی کے اندر تکثیر کا معنی ہے اور یہ اس کو کہا جاتا ہے جو علم و عمل میں صرف خدا کی طرف متوجہ ہو اور اس کے غیر کی طرف کوئی دھیان نہ کرے۔ معنی اول کو علامہ طبرسی اور دیگر کلمہ شناسان کی تائید حاصل ہے[41]، جبکہ معنی دوم کو علامہ طباطبائی نے قبول کیا ہے[42]۔ البتہ علامہ طباطبائی نے سورہ مائدہ کی آیت ۴۴ اور ۶۳ کی تفسیر کے ذیل میں ربانیون کو مربی کے معنی میں بھی ذکر کیا ہے[43]۔ خدا کے نزدیک ہونے کا لازمہ اخلاق حمیدہ اور اعمال صالحہ ہیں، اور ایسے مؤدب، شائستہ اور خدا کے مقرب بندے خود بخود لوگوں کے مربی قرار پاتے ہیں، جبکہ باہدف تربیت کرنے والا، صرف خدا کی رضا کی خاطر سب کچھ کرتا ہے۔ اس لحاظ سے ان دونوں معنوں میں بھی تلازم پایا جاتا ہے۔[44]

"ربیّون" کے ذیل میں اکثر جگہ وہی مراد لیا گیا ہے کہ کوئی غیر خدا میں مشغول نہ ہو اور اس کا خدا سے محکم اور مسلسل رابطہ ہو۔ البتہ تفسیر روشن میں اس کا معنی تربیت شدگان بھی کیا گیا ہے۔ اس لحاظ سے یہ "ربیّ" کی جمع ہے اور ربیّ دراصل کلمہ "ربّہ" اور مصدر ہے[45]۔ اس کا ایک مطلب، پیغمبر کے پیروی کرنے والے بھی بنتا ہے۔[46] ان ۴ آیات میں مربی، متربی اور ان کی صفات کو بیان کیا گیا ہے۔ قرآن کریم میں موجود "ربیّ" اور "ربانی" کے کلمات، جو آج کل کی اصطلاحات کے مطابق شاگرد اور استاد سے مناسبت رکھتے ہیں، ربّ سے ہی منسوب ہیں اور تربیت کی خصوصیات سے متعلقہ قرآنی نکتہ نظر کے بیان گر ہیں۔ ربیّ کی نسبت، ربّانی کے کلمہ میں ربّ کے ساتھ یہ نسبت زیادہ ہے (حرف نون کے اضافے کی وجہ سے)، اس سے یہ نتیجہ نکال سکتے ہیں کہ شاگرد کی نسبت، استاد کا خدا سے رابطہ اور تعلق حتماً زیادہ اور گہرا ہونا چاہیے تاکہ وہ تربیت پانے والوں کی بھرپور ہدایت کر سکے۔ توجہ کا طالب اہم نکتہ یہ ہے کہ تربیت، تربیت کرنے والے، اور تربیت پانے والے، ان تینوں کا مبدا، محور اور نقطہ

ارتکاز، فقط خداوند عالم کی ذات گرامی ہے۔ آخری کلمہ "ربائب" ہے، جس کے بارے میں پہلے ذکر گزر چکا کہ یہ "ربیبه" کی جمع ہے اور بیوی کی اس اولاد کے بارے اس استعمال کیا جاتا ہے جو دوسرے شوہر کے زیر سایہ پرورش پارہی ہو[47]۔

اس بحث کے خلاصہ کے طور پر یہ کہہ سکتے ہیں کہ اگر اصلی حروف "ر ب ب" کے قرآن شریف میں استعمال کا جائزہ لیں تو اس کے مشتق شدہ الفاظ میں سے لفظ "ربّ" کے "پالنے والے" اور "پروردگار" کے معنی کے عنوان سے اور دوسرے "ربّانی" اور "ربیّون" کے "مربی" و "متربی" کے معنی کے ذیل میں، تربیت کے قرآنی مفہوم کی خصوصیات واضح ہوتی ہیں۔ اسی طرح اصلی حروف "ر ب و" کے استعمال کے موارد سے واضح ہوتا ہے کہ پرورش کا مفہوم فقط جسمانی رشد میں محصور نہیں، بلکہ ہر قسم کا رشد منظور نظر ہے[48]۔ لہٰذا، قرآن کریم کی نظر میں تربیت کا مفہوم ایک شخص کو انسان ہونے کے ہر پہلو کے لحاظ سے الٰہی اور مقرب خدا انسان بنانا ہے[49]۔

تربیت کی خصوصیات

تربیت کا لفظ کن اصلی حروف سے مشتق ہوا ہے اور ان میں سے کونسا بنیادی ہے اور کونسا ثانوی، اس بارے میں کلمہ شناسان کی نظر میں اختلاف پایا جاتا ہے، لیکن مجموعی طور پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ لغت شناسان کے نزدیک، لفظِ تربیت کا معنی بہت وسیع ہے اور یہ رشد و پرورش کے تمام جسمانی اور روحانی پہلوؤں کو اپنے اندر شامل رکھتا ہے[50]۔ لفظ تربیت کے اصلی حروف اور لغت کے بارے میں کی گئی اب تک کی بحث کی روشنی میں، تربیت کے مفہوم سے متعلق درج ذیل نکات پیش خدمت ہیں:

1) 'ر ب ب' کے اصلی حروف اپنے اندر دو بنیادی عناصر رکھتے ہیں، ایک مالکیت اور دوسرے تدبیر؛ یعنی 'ربّ' بمعنی مدبر مالک ہے۔ ایک ایسا مالک جو صاحب مملوک ہے اور اس ملکیت کی تنظیم و تدبیر بھی فقط اسی کے ہی اختیار میں ہے۔ کائنات کی ایسی حقیقی مالک صرف ایک ذات ہے، اس کے علاوہ تمام مالکیتیں اس کی عطا کردہ اور اعتباری ہیں۔

2) پروردگار عالم نے اس کائنات کے حقیقی مبدا، مالک اور مدبر ہونے کے عنوان سے موجودات کو، تمام درکار صلاحیات اور استعدادوں کے ساتھ ہی خلق فرمایا۔ اس مادی دنیا میں موجودات کی ان صلاحیتوں کی سرپرستی نیز انکو نکھارنے اور افزائش دینے کے لیے مناسب ماحول کی فراہمی درکار ہے، اس کام کے لئے بھی اللہ تعالیٰ نے ہی مختلف قسم کے وسیلے قرار دیئے ہیں۔ اصلی حروف 'ر ب ب' اور 'ر ب و' میں کمیت اور کیفیت نیز جسمانی

اور غیر جسمانی حوالے سے پرورش اور رشد کے مفاہیم سے یہی مراد ہے کہ پہلے سے موجود ان استعدادوں کی، انہی دیئے گئے وسائل کی مدد سے پرورش کرنے کی تدبیر کی جائے۔

3) اعتباری مالکیت اپنے ساتھ ذمہ داری لے کر آتی ہے، لہٰذااس دی گئ ملکیت کی سرپرستی، نگرانی اور ہر قسم کے فساد اور ضرر سے بچاؤ، صاحب ملکیت کے ذمہ ہوتی ہے۔اس کے علاوہ اس ملکیت کی بہبود اور سلامتی کی تدابیر بھی اسی سرپرستی کا جزو قرار پاتی ہیں ،۔ اصلی حروف 'ر ب ب' میں سرپرستی اور نگرانی کا معنی اسی خصوصیت کی طرف اشارہ کرتا ہے۔

4) اگر مورد نظر چیز ایسی ہو جو قابل تغیر ہو اور رشد کرنے کی صلاحیت رکھتی ہو، جیسے انسان ،تو اس کو ایک حالت سے دوسری حالت میں منتقل کرنے ،اور اس کی جنس کے متناسب ، اس کے مقررہ ہدف تک پہنچانے، یا باالفاظ دیگر کامل کرنے کی اضافی ذمہ داری بھی اس کے مسئول اور مدیر کے ذمہ ہوتی ہے۔اس مقصد کی خاطر درکار تمام لوازمات کی فراہمی اس ذمہ داری کا لازمہ ہے۔'ر ب ب' میں شامل ، کسی چیز کو ایجاد کرنے اور کمال تک پہنچانے کے معنی ، یہی مفہوم رکھتے ہیں۔

5) یہاں تربیت کے دو اراکین یعنی مربی (تربیت دینے والا) اور متربی (جس کو تربیت دی جائے) کا نقش بھی واضح ہوتا ہے، کہ جس میں مربی ، متربی کی تربیت اور پرورش کے تمام امور پر دقت کرتا ہے، اور متربی کے جسمانی اور غیر جسمانی تمام امور کی افزائش اور رشد کو مورد نظر قرار دیتا ہے۔ 'ر ب ب' اور 'ر ب و' کے معانی کا باہم اشتراک یہاں ملاحظہ کیا جا سکتا ہے۔

6) ہدف کی طرف بڑھانے اور کمال تک پہنچانے کے ذمہ دار یعنی مربی کے لئے ، کامل ہونے والی شئی یعنی متربی کی صلاحیتوں، استعدادوں، قابلیتوں اور حالتوں وغیرہ کے بارے میں کامل آگاہی اور معرفت لازمی ہے۔ایک اور اہم پہلو خود مربی کا ان تمام پہلوؤں پر تسلط اور حصول ہے تاکہ اپنے زیرِ تربیت کی درست رہنمائی کر سکے۔لفظِ تربیت کا باب تفعیل سے ہونا ، عامل کے اثر گذار ہونے اور معمول کے اثر پذیر ہونے کا یہی مفہوم اپنے اندر رکھتا ہے۔

7) ہدف تک پہنچنے اور کمال کے حصول کے لیے ضروری ہے کہ تمام موجود صلاحیتیں یا استعدادیں پرورش کے لئے بیک وقت مورد نظر ہوں اور افزائش پا سکیں۔یہ ہمہ جانب پرورش اور صلاحیتوں کی کامل افزائش ، 'ر

ب و' میں زیادتی، بڑھوتری اور بلندی کے معانی کی مصداق ہے۔اس کے ساتھ ساتھ باب تفعیل کے کثرت کا معنی بھی اس میں شامل ہو کر مزید اضافے کی تاکید کرتا ہے۔

8) کسی ایک یا چند مخصوص صلاحیتوں کی زیادہ افزائش، جبکہ باقی استعداوں کی پرورش سے پہلو تہی، کمال کے حصول میں رکاوٹ ہے۔ صلاحیتوں کی پرورش میں تعدیل، مربی اور متربی ہر دو کی جانب سے اصلاح اور تدبیر کی محتاج ہے۔ 'ر ب ب' میں مصلح کا معنی اور باب تفعیل میں اثر گذاری اور اثر پذیری کا مطلب، تربیت کے لفظ میں یہ خصوصیت شامل کرتے ہیں۔

9) کمال کا حصول دفعی امر نہیں ہے بلکہ ایک زمان کا متقاضی ہے اور تدریجاً حاصل ہوتا ہے۔ مختلف مدارج کے لحاظ سے اس کے مختلف مراحل ہوتے ہیں، جو ایک کے بعد ایک طے کیے جاتے ہیں۔ لفظِ تربیت کا باب تفعیل سے ہونا، تدریج کی اسی خصوصیت کا متضمن ہے۔

10) کامل کرنے کی ذمہ داری، مسلسل کوشش، نگرانی اور مستقل مزاجی کی متقاضی بھی ہوتی ہے، اس کے علاوہ ایک اور اہم پہلو، اپنی زیر نگران چیز کی، اس کے کمال کی سمت حرکت سے کسی بھی قسم کی روگردانی کی اصلاح اور اسے واپس اپنی اصلی حالت پر لانے کا ہے۔ یہ امور اصلاح، تدبیر، توجہ اور تسلسل کے مفاہیم کے مصادیق ہیں، جو لفظِ تربیت کے اصلی حروف میں پائے جاتے ہیں۔

11) تغیر، تدریج اور تعدیل وغیرہ کے مفاہیم ایک اور چیز کے متقاضی بھی ہیں اور وہ یہ کہ تربیت، صناعت کی صنف سے تعلق نہیں رکھتی کہ کسی چیز کو انفعالی انداز میں آہستہ آہستہ بنا ڈالیں۔ بلکہ تربیت، لوازمات کی فراہمی اور ان کی تدبیر کا نام ہے کہ جن کی مدد سے متربی بتدریج رشد اور نشو و نما پاتا ہے، اس لحاظ سے تربیت کرنے کے بجائے دینے کا عمل ہے، جہاں پر ایک متربی کی جنس سے متناسب ضروریات اور لوازمات پر مشتمل ماحول کو فراہم کیا جاتا ہے، اور متربی فعالی انداز میں، اختیاراً اپنے رشد کا سفر طے کرتا ہے۔

12) 'ر ب ب' کے معنی کے مطابق ایک حالت سے دوسری حالت میں تغیر اور رشد کی صلاحیت، اس امکان کی حامل ہے کہ معمول تمام ممکنہ اور متعلقہ، وسیلوں، ذریعوں یا عوامل سے اثر قبول کر سکے۔ اس لحاظ سے تربیت کسی ایک خاص مکان، زمان یا مخصوص عامل تک محدود نہیں رہتی۔ البتہ اس بات کا امکان ہے کہ اثر گذاری کے لحاظ سے کوئی زمان، مکان یا عامل نسبتاً زیادہ موثر ہو۔

13) انسان ایک اجتماعی مخلوق ہے، اس لحاظ سے اجتماع سے اثر قبول بھی کرتا ہے اور اسی طرح اجتماع پر اثر گذار بھی ہے۔اس کے ساتھ ساتھ خود تربیت کا مفہوم بھی کسی خاص زمان و مکان یا عامل میں محدود نہیں، اور عمومی اثر پذیری کا پہلو رکھتا ہے، لہٰذا کہہ سکتے ہیں کہ تربیت انفرادی پہلو رکھنے کے ساتھ ساتھ اجتماعی پہلو بھی رکھتی ہے۔

14) تربیت، تغیر، اصلاح اور اختیار جیسے مفاہیم کی حامل ہے، اس کے ساتھ ساتھ عمومی اثر گذاری اور اثر پذیری کا عنصر بھی اس موضوع میں شامل ہے۔اس لیے اس بات کا امکان بھی ہے کہ تربیت پانے والا، اصلاح کی عدم موجودگی یا عدم قبولیت کی صورت ، منفی اثر قبول کر لے اور اس اثر کے تحت اس کے سفر کی سمت ، صعودی کے بجائے نزولی ہو جائے۔

15) تربیت کی مثبت یا منفی جہت کا امکان ، تربیت کے با ہدف ہونے اور رکھے جانے کی اہمیت کو ظاہر کرتا ہے۔ساتھ ہی اس کے اصلی حروف کا لفظ 'ربّ' سے متعلق ہونا، اس کی درکار مثبت جہت اور ہدف کا تعین بھی کر دیتے ہیں۔

16) کمال کی طرف حرکت، یعنی استعدادوں کی رشد و ترقی، باب تفعیل کے کثرت اور زیادتی کے مفہوم کا مصداق ہے۔ یہاں ایک جالب نکتہ یہ ہے کہ رب مطلق کی جانب سے تفویض کردہ پرورش کی یہ ذمہ داری، اس کمال کی طرف حرکت کی تشویق کرتی ہے کہ جس کی کوئی انتہا نہیں، اس لحاظ سے کثرت و کمال کا یہ سفر ہمیشہ جاری رہتا ہے۔

تربیت کا مفہوم

تو تربیت (چاہے اصلی حروف 'ر ب و' سے ہو یا 'ر ب ب' سے، یا ان دونوں سے) کے معنی پرورش کرنے اور کسی شئی کو درکار تمام ضروریات بہم پہنچا کر اس چیز کو بتدریج اس کے کمال تک پہنچانے کے بنیں گے ،اور اس مفہوم میں اصلاح، تدبیر، تادیب، حفاظت، نگرانی، بتدریج کمال، مالکیت، ولایت، سرپرستی، تغذیہ، رشد، افزائش، بڑھوتری، نشو و نما وغیرہ کے معنی شامل ہوں گے[51]۔ نیز یہ کہ تربیت صرف کمیت کی زیادتی اور جسمانی پہلو تک محدود نہیں ہو گی بلکہ تمام ممکنہ مادی و غیر مادی پہلوؤں اور کیفیت کی بالاتری کو بھی اپنے مفہوم میں شامل رکھے گی۔اسی طرح تربیت دینا، یعنی کسی چیز کو، اس کے مقدر کردہ ہدف کی جانب، اس کی ذاتی استعداد

وں اور فطری صلاحیتوں کے مطابق، مرحلہ بمرحلہ مرتبہ کمال کو پہچانا۔اس پرورش میں محبت، شفقت، حفاظت، نگہداشت اور امنیت کا عنصر موجود ہے۔ جیسے والدین بچے کو پالتے ہیں اور اس کی ہر ضرورت کو اس کی موجودہ استعداد کے مطابق، بروقت اور حسب موقع پورا کرتے ہوئے اس کو ہر ضرر اور نقصان سے بچا کر رکھتے ہیں[52]۔

کلی طور انسان وہ موجود ہے جو مختلف استعداد اور صلاحیتیں لے کر پیدا ہوتا ہے، لیکن یہ صلاحیتیں خام حالت میں ہوتی ہیں اور ان کو رشد و ہدایت کی ضرورت ہوتی ہے۔اس رشد و ہدایت کے مناسب ماحول کی فراہمی کو تربیت کا نام دیا جاتا ہے اور اس ہدف کے لیے درکار ہر چیز، خواہ وہ جسم کے لئے ہو یا روح کے لئے، مادی ہو یا غیر مادی، پیدائش سے پہلے درکار ہو یا بعد میں، ارادی طور پر حاصل ہو یا غیر ارادی طور پر، رسمی طور پر لی جائے یا غیر رسمی طور پر، کل وقتی ہو یا جز وقتی، اختیاری ہو یا اجباری، اکتسابی ہو یا وراثتی، انفرادی ہو یا اجتماعی، تربیت کے موضوع کے زمرے میں قرار پائے گی۔

تعلیم

تربیت کے موضوع سے متعلقہ کلمات میں سے ایک اہم کلمہ تعلیم ہے۔ تعلیم اور تربیت ایک دوسرے کے مترادف یا مساوی نہیں ہیں۔ تعلیم کا مفہوم ایک خاص پہلو کا حامل ہے اور تربیت کے عام مفہوم کا ایک جز ہے۔ اس لحاظ سے تربیت اور تعلیم میں عام اور خاص کی نسبت بنتی ہے اور انسان کی تعلیم کا انتظام کر دینا، تربیت کے صرف ایک جز کو پورا کرنا ہے۔البتہ تعلیم، ہمیشہ تربیت کے مقدمہ کے طور پر، تربیت کے پہلوؤں کی مناسبت سے، تربیت پر مقدم ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ تربیت ایک کلی ہدف رکھتی ہے، اور تعلیم اسی کلی ہدف کے ذیل میں انجام پاتی ہے۔ لہٰذا وہ تعلیم، تربیت کا جز ہے جو تربیت کے اس کلی ہدف سے ہم آہنگ ہو۔

نتیجہ بحث

انسان اپنی زندگی کے آغاز میں، جسمانی طور پر ضعیف ہوتا ہے اور اپنی زندگی کی بقا کے لئے دوسرے انسانوں کا شدید نیاز مند ہوتا ہے۔ رفتہ رفتہ وہ اپنی جسمانی نیاز خود پورا کرنے کے قابل ہو جاتا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ اس کی روحانی نیاز اور ضروریات بڑھنا شروع ہو جاتی ہیں۔ نیز انفرادی ضروریات کے علاوہ، اجتماعی ضروریات بھی اس فہرست میں شامل ہو جاتی ہیں۔ ان تمام ضروریات کو پورا کرنے اور ذمہ داریوں سے بطریق احسن عہدہ براں ہونے کے لیے، پروردگار نے انسان کے اندر تمام مطلوبہ صلاحیتیں اور استعدادیں رکھ دی ہیں۔ انسان کی ان صلاحیتوں کی پرورش کرنے اور نکھارنے کے لئے ایک ماحول درکار ہوتا ہے۔ ایک ایسا ماحول، جو اس کی جسمانی اور روحانی استعدادوں کی نشوونما میں کوئی رکاوٹ پیدا نہ ہونے دے۔ نتیجتاً، وہ ان تمام صلاحیتوں کو رشد دے کر اپنے مقصد حقیقی کی جانب بڑھ کر سکے۔ اسی ماحول کی فراہمی کا دوسرا نام تربیت ہے۔ مختلف زبانوں میں

تربیت کا لفظ بطور کلی جسمانی اور روحانی پرورش، دونوں کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ نیز تدریجی پرورش، نمو، رشد، سرپرستی، اصلاح اور اتمامیت کے مفاہیم بھی اس میں شامل ہیں۔

قرآن کریم میں لفظ تربیت کے مشتقات کے استعمال کو دیکھا جائے تو تقریباً ۱۰۰۰ آیات میں ان کا ذکر ہوا ہے۔ البتہ یہ استعمال اکثراً، خدا کی ربوبیت کی صفت کے حوالے سے ہوا ہے۔انسان کی تربیت کے حوالے سے، جو مشتقات ذکر ہوئے ہیں ان میں مربی ('ربّانی')اور متربی ('ربیّون')کے مفاہیم سب سے اہم ہیں۔اگر اصلی حروف کی نسبت کے حوالے سے بات کریں تو کمیت یا جسمانی پرورش ('ر ب و')کے مقابلے میں روحانی پرورش اور کمال کی جانب حرکت کی تشویق ('ر ب ب')کے اصلی حروف کا استعمال کثرت سے ہوا ہے۔اس لحاظ سے کہا جا سکتا ہے کہ قرآن مجید میں روحانی پرورش اور استعداد و صلاحیت کے رشد پر زیادہ زور دیا گیا ہے۔ تربیت کے مفہوم کے جائزے کے نتیجے میں جو مختلف پہلو اور خصوصیات سامنے آئی ہیں، ان کی ایک خام طبقہ بندی کی جا سکتی ہے۔ یہ پہلو اور ان کی خصوصیات درج ذیل جدول میں ملاحظہ کیے جا سکتے ہیں۔

تربیت کے مختلف پہلو اور ان کی خصوصیات

تربیت کے مقدمات	○ رب حقیقی فقط اللہ تعالی کی ذات ○ مسئولیت و ذمہ داری از طرف خداوند کریم ○ انسان میں صلاحیات کی فطری موجودگی ○ انسان، ارادہ اور اختیار کے ساتھ تغیر پذیر موجود
تربیت کے لوازمات	○ تربیت کے لئے درکار ماحول کی فراہمی ○ سرپرستی، نگرانی اور مسلسل کوشش ○ سلامتی، حفاظت، ضرر سے بچاؤ ○ اصلاح و تدبیر امور
تربیت کے اراکین	○ تربیت سے متعلقہ تعلیمات، اصول اور احکام ○ مربی کا تمام جسمانی اور روحانی استعدادوں سے آگاہ ہونا ○ مربی کا اپنی ذات کے پہلوؤں پر تسلط ○ تربیت پانے والے کی اختیاری کوشش

تربیت کے اصول	○ تمام جسمانی و روحانی پہلوؤں کی ہمہ جانب پرورش ○ تدریج، طولی مراحل اور عرضی پہلو ○ تسلسل ○ تعدیل
تربیت کا دائرہ کار	○ ہر زمان میں تربیت کا امکان ○ ہر مکان میں تربیت کا امکان ○ ہر عامل سے اثر قبول کرنے کا امکان ○ انفرادی و اجتماعی پہلو
تربیت کی سمت	○ باہدف ○ لامتناہی ○ کمال کی جانب حرکت ○ مثبت یا منفی جہت کا امکان

*****

حوالہ جات

1۔ ناصر، مکارم شیرازی، *تفسیر نمونہ*، ج 11 (تہران، دارالکتب الاسلامیہ، 1371 شمسی)، 361۔

2۔ مرتضٰی، مطہری، *آزادی معنوی* (تہران، انتشارات صدرا، 1378 شمسی) 17۔

3 ۔ مرتضٰی، مطہری، *انسان در قرآن* (تہران، انتشارات صدرا، 1391 شمسی) 32۔

4 ۔ مرتضٰی، مطہری، *فطرت* (تہران، انتشارات صدرا، 1396 شمسی) 29۔

5۔ سید محمد رضا، طباطبائی، *صرف سادہ* (قم، انتشارات دارالعلم، 1397 شمسی) 163۔

6۔ علی رضا، اعرافی، *فقہ تربیتی*، ج 1: مبانی و پیش فرض ھا (قم، مؤسسہ فرہنگی و ہنری اشراق و عرفان، 1393 شمسی) 118۔

7۔ محمد، بہشتی، *مبانی تربیت از دیدگاہ قرآن* (تہران، سازمان انتشارات پژوہشگاہ فرہنگ و اندیشہ اسلامی، 1386 شمسی) 31 ؛ علی ہمت، بناری، نگرشی بر تعامل فقہ و تربیت (قم، انتشارات مؤسسہ آموزشی وپژوہشی امام خمینی، 138 شمسی) 59۔

8۔ بہروز، رفیعی، *آرای دانشمندان مسلمان در تعلیم و تربیت و مبانی آن*، ج 3: امام غزالی (تہران، سمت، 1390 شمسی) 89۔

9۔ حسین، مہدی زادہ، بررسی جایگاہ عقل در تربیت از دیدگاہ امام کاظم علیہ السلام در روایت ہشام بن حکم (قم، موسسہ آموزشی پژوہشی امام خمینی،1387 شمسی) 146۔
10۔بناری، نگرشی بر تعامل فقہ و تربیت 59۔
11۔ابن فارس، معجم مقائیس اللغۃ، ج 2، 483۔
12۔ حسین بن محمد، راغب اصفہانی، مفردات الفاظ القرآن، 340۔
13۔ فخر الدین، طریحی، مجمع البحرین، ج 2 (تہران، مکتبہ المرتضویہ،1375 شمسی)، 65۔
14۔ محمد بن مکرم، ابن منظور، لسان العرب، ج 1، 401۔
15۔ خلیل بن احمد، فراہیدی، کتاب العین، ج 8 (قم، نشر ہجرت،1409ھ) 257۔
16۔ محمد بن مکرم، ابن منظور، لسان العرب، ج 1، 401۔
17۔ابن فارس، معجم مقائیس اللغۃ، ج 2، 381۔
18۔ حسین بن محمد، راغب اصفہانی، مفردات الفاظ القرآن، 336۔
19۔بناری، نگرشی بر تعامل فقہ و تربیت 59۔
20۔ بہشتی، مبانی تربیت از دیدگاہ قرآن 33۔
21۔ محمد، مرتضی زبیدی، تاج العروس من جواہر القاموس، ج 2 (بیروت، دار الفکر،1414ھ)، 4۔
22۔ محمد بن مکرم، ابن منظور، لسان العرب، ج 1، 399۔
23۔ حسین بن محمد، راغب اصفہانی، مفردات الفاظ القرآن، 336۔
24۔ علی جواد، ہمدانی، "اسلام اور مغربی تعلیم و تربیت کے فلسفی مبانی"، سہ ماہی سماجی، دینی، تحقیقی مجلّہ نور معرفت، جلد۱، شمارہ۶(2015 عیسوی)، 116۔
25۔فیروز اللغات اردو جامع (لاہور، فیروز سنز (پرائیویٹ) لمیٹڈ) 354۔
26۔ محمد، معین، فرہنگ فارسی، ج 1 (تہران، انتشارات امیر کبیر،1360 شمسی) 1063۔
27۔ علی اکبر، دہخدا، لغت نامہ، ج 14 (تہران، ، موسسہ انتشارات دانشگاہ تہران، 1372 شمسی) 550۔
28۔ حسن، عمید، فرہنگ عمید (تہران، امیر کبیر،1369 شمسی) 425۔
29۔اعرافی، فقہ تربیتی، ج 1: 122۔
30۔ علی جواد، ہمدانی، "اسلام اور مغربی تعلیم و تربیت کے فلسفی مبانی": 117۔
31۔بناری، نگرشی بر تعامل فقہ و تربیت 59۔
32۔مصباح یزدی، فلسفہ تعلیم و تربیت اسلامی 29۔
33۔بناری، نگرشی بر تعامل فقہ و تربیت 63۔
34۔ محمد علی، رضائی اصفہانی، قرآن و تربیت (تفسیر موضوعی میان رشتہ ای قرآن و علوم)، ج 1 (تہران، سازمان دار القرآن کریم، نشر تلاوت،1394 شمسی) 16۔

35۔رہنمائی، *فلسفہ تعلیم وتربیت* 27۔

36۔ محمد عالم، احمد زادہ، "*مفہوم شناسی تربیت در قرآن کریم*"، مطالعات فقہ تربیتی، شمارہ13 (1389 شمسی)3۔

37۔بناری، *نگرشی بر تعامل فقہ وتربیت* 62۔

38 ۔ مصباح یزدی، *فلسفہ تعلیم وتربیت اسلامی* 26۔

39 ۔ حسین، مہدی زادہ، "کاوشی در ریشہ قرآنی واژہ 'تربیت' و پیامد معنای آن"، مجلّہ معرفت، شمارہ 59 (1389 شمسی)4 ۔

40 ۔ بناری، *نگرشی بر تعامل فقہ وتربیت* 63۔

41 ۔ علی اکبر، قرشی بنابی، *قاموس قرآن*، ج 3، (تہران: دارالکتب الاسلامیہ،1381 شمسی)45۔

42۔ محمد حسین، طباطبائی، ترجمہ *تفسیر المیزان*، ج 3، ترجمہ: محمد باقر موسوی، (قم، دفتر انتشارات اسلامی،1374 شمسی) 436۔

43۔ محمد حسین، طباطبائی، ترجمہ *تفسیر المیزان*، ج 5، 561۔

44 ۔ بہشتی، *مبانی تربیت از دیدگاہ قرآن* 34۔

45 ۔ محمد عالم، احمد زادہ، "*مفہوم شناسی تربیت در قرآن کریم*"، مطالعات فقہ تربیتی: 6۔

46 ۔ باقری، *نگاہی دوبارہ بہ تربیت اسلامی*: (کاوشی برای تدوین چہار چوب نظری تربیت اسلامی)، ج 1، 64۔

47 ۔ فضل بن حسن، طبرسی، ترجمہ *تفسیر مجمع البیان*، ج 5، ترجمہ: احمد بہشتی (گروہ مترجمین) (تہران، مؤسسہ انتشارات فرہانی،1356 شمسی) 94۔

48 ۔ بہشتی، *مبانی تربیت از دیدگاہ قرآن* 35۔

49 ۔ باقری، *نگاہی دوبارہ بہ تربیت اسلامی*: (کاوشی برای تدوین چہار چوب نظری تربیت اسلامی)، ج 1، 64۔

50 ۔ بناری، *نگرشی بر تعامل فقہ وتربیت* 61۔

51 ۔ محمد عالم، احمد زادہ، "*مفہوم شناسی تربیت در قرآن کریم*"، مطالعات فقہ تربیتی:3۔

52 ۔ چوہدری علی، محمد، *انوار البیان فی حل لغات القرآن*، ج 1(لاہور، مکتبہ سید احمد شہید،2005 عیسوی)، 5۔

کتابیات

1. مکارم شیرازی، ناصر، تفسیر نمونہ، تہران، دار الکتب الاسلامیہ،1371 شمسی۔
2. مطہری، مرتضٰی، آزادی معنوی، تہران، انتشارات صدرا،1378 شمسی۔
3. مطہری، مرتضٰی، انسان در قرآن، تہران، انتشارات صدرا،1391 شمسی۔
4. مطہری، مرتضٰی، فطرت، تہران، انتشارات صدرا، 1396 شمسی۔
5. طباطبائی، سید محمد رضا، صرف سادہ، قم، انتشارات دار العلم،1397 شمسی۔
6. رہنمائی، سید احمد، فلسفہ تعلیم وتربیت (غربی واسلامی)، تہران، سمت، 1396 شمسی۔
7. اعرافی، علی رضا، فقہ تربیتی، قم، مؤسسہ فرہنگی وہنری اشراق وعرفان، 1393 شمسی۔
8. بہشتی، محمد، مبانی تربیت از دیدگاہ قرآن، تہران، سازمان انتشارات پژوہشگاہ فرہنگ واندیشہ اسلامی، 1386 شمسی۔

9. بناری، علی ہمت، نگرشی بر تعامل فقہ وتربیت، قم، انتشارات مؤسسہ آموزشی وپژوہشی امام خمینیؒ،138 شمسی۔
10. رفیعی، بہروز، آرای دانشمندان مسلمان در تعلیم وتربیت و مبانی آن، تہران، سمت،1390 شمسی۔
11. مہدی زادہ، حسین، بررسی جایگاہ عقل در تربیت از دیدگاہ امام کاظم علیہ السلام در روایت ہشام بن حکم، قم، مؤسسہ آموزشی پژوہشی امام خمینی، 1387 شمسی۔
12. ابن فارس، احمد، معجم مقائیس اللغۃ، قم، مکتب الاعلام الاسلامی،1404ھ۔
13. ابن منظور، محمد بن مکرم، لسان العرب، بیروت، دار صادر،1414ھ۔
14. راغب اصفہانی، حسین بن محمد، مفردات الفاظ القرآن، بیروت، دار القلم،1416ھ۔
15. باقری، خسرو، نگاہی دوبارہ بہ تربیت اسلامی: (کاوشی برای تدوین چہارچوب نظری تربیت اسلامی)، تہران، انتشارات مدرسہ،1385 شمسی۔
16. مصباح یزدی، محمد تقی، فلسفہ تعلیم وتربیت اسلامی، تہران، انتشارات مدرسہ، 1390 شمسی۔
17. مصطفوی، حسن، التحقیق فی کلمات القرآن الکریم، تہران، مؤسسہ الطباعہ والنشر،1416ھ۔
18. قائمی مقدم، محمد رضا، روش ہای تربیتی در قرآن، تہران، سمت،1391 شمسی۔
19. احسانی، محمد، تربیت عقلانی از منظر قرآن کریم، تہران پژوہشگاہ علوم وفرہنگ اسلامی، 1394 شمسی۔
20. طریحی، فخر الدین، مجمع البحرین، تہران، مکتبہ المرتضویہ، 1375 شمسی۔
21. فراہیدی، خلیل بن احمد، کتاب العین، قم، نشر ہجرت، 1409ھ۔
22. مرتضی زبیدی، محمد، تاج العروس من جواہر القاموس، بیروت، دار الفکر،1414ھ۔
23. معین، محمد، فرہنگ فارسی، تہران، انتشارات امیر کبیر، 1360 شمسی۔
24. دہخدا، علی اکبر، لغت نامہ، تہران، مؤسسہ انتشارات دانشگاہ تہران، 1372 شمسی۔
25. عمید، حسن، فرہنگ عمید، تہران، امیر کبیر، 1369 شمسی۔
26. فیروز اللغات اردو جامع، لاہور، فیروز سنز (پرائیویٹ) لمیٹڈ۔
27. رضائی اصفہانی، محمد علی، قرآن و تربیت (تفسیر موضوعی میان رشتہ ای قرآن و علوم)، تہران، سازمان دارالقرآن کریم، نشر تلاوت،1394 شمسی۔
28. قرشی بنابی، علی اکبر، قاموس قرآن، تہران: دار الکتب الاسلامیہ،1381 شمسی۔
29. طباطبائی، محمد حسین، ترجمہ تفسیر المیزان، ترجمہ: محمد باقر موسوی، قم، دفتر انتشارات اسلامی،1374 شمسی۔
30. طبرسی، فضل بن حسن، ترجمہ تفسیر مجمع البیان، ترجمہ: احمد بہشتی (گروہ مترجمین)، تہران، مؤسسہ انتشارات فرہانی،1356 شمسی۔
31. نعمانی، محمد عبد الرشید، لغات القرآن، لاہور، مکتبہ حسن سہیل،1962 عیسوی۔
32. محمد، چوہدری علی، انوار البیان فی حل لغات القرآن، لاہور، مکتبہ سید احمد شہید، 2005 عیسوی۔

الٰہی صفات کے معانی کی شناخت

(مرتضی مطہری کی نظر میں)

SEMANTICS OF DIVINE ATTRIBUTES

(From the viewpoint of Mortaza Motahari)

Dr. Syed Muhammad Faheem Abbas

Abstract:

In theology, an important issue is the interpretation of the divine attributes. The question that arises in this regard is: whether it is possible to identify divine attributes? Does the same sense can be used about human traits and divine attributes? In this study, it is tried to analysis the viewpoint of Martyr Mortaza Motahari regarding divine attributes.The author concludes that Mortaza Motahari rejects the doctrine of transcendence and pure metaphor and believes that attributes such as knowledge, life and power have equal meaning between God and man.

***Key words**: Motahari, Semantics, Divine attributes.*

خلاصہ

الٰہیات اور خدا شناسی کی ابحاث میں الٰہی صفات کے معانی کی شناخت کی بحث کو بہت اہمیت حاصل ہے۔ اس بحث میں عمدہ سوالات یہ پیدا ہوتے ہیں کہ آیا خداوند تعالی کی کوئی صفات ہیں؟ کیا ان صفات کی شناخت اور پہچان ممکن ہے؟ آیا انسانی صفات کے جو معانی ہیں، خدائی صفات کے بھی وہی معنی ہیں؟ ان سوالات کے پیش نظر اس مقالے میں عالم اسلام کے ایک عظیم دانشور اور عالم، شہید مرتضی مطہری کے نظریات کی روشنی میں ان سوالات کا جواب حاصل کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ شہید مطہری کے اس موضوع پر فلسفیانہ اور کلامی دلائل کے مطالعہ سے معلوم ہوتا کہ ہے انہوں نے صفات الٰہی کے باب میں تنزیہ محض اور تشبیہ محض کے نظریہ کو ردّ کیا ہے اور ان کے عقیدہ کے مطابق علم، حیات اور قدرت جیسی صفات میں، خدا اور انسان کے درمیان معنوی اشتراک پایا جاتا ہے۔

کلیدی کلمات: مطہری، معنی شناسی، الٰہی صفات۔

تعارف

الٰہی صفات کے معانی کی شناخت کی بحث کب سے شروع ہوئی، یہ ابھی واضح نہیں ہے۔ لیکن اس بارے میں لکھی گئی کچھ کتابوں کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ایسے مسائل اور ابحاث، افلاطون کے زمانے سے بھی پہلے اٹھائے گئے تھے۔ [1] اگر ہم اسلامی کتب پر نگاہ ڈالیں تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ مسائل دوسری صدی ہجری میں پیش آئے۔ [2] تاہم مسلمانوں کے علاوہ یہودیوں اور عیسائیوں نے بھی اس مسئلہ پر بحث کی ہے۔ بنابریں، اس مقالہ کا اصلی سوال یہ ہے کہ کیا کیا خدائی صفات کی شناخت ممکن ہے؟ آیا الٰہی صفات کا وہی معنی مراد لیا جاسکتا ہے جو انسان کو ان صفات سے متصف کرتے وقت مراد لیا جاتا ہے؟ اگرچہ اس مسئلہ پر فَلاسِفَرز اور مسلمان اسکالرز کے مختلف نظریات سامنے آئے ہیں لیکن اس تحقیق میں شہید مرتضی مطہری کی ناقدانہ نظر اور دلائل کو بیان کیا گیا ہے۔ تاہم اس مسئلہ کا تاریخی جائزہ لینے کے لئے ذیل میں اس حوالے سے یہودی، عیسائی اور مسلمان مفکرین کے نظریات کا اجمالی جائزہ بھی پیش کیا گیا ہے۔

یہودی اور عیسائی مفکرین

بطور کلی یہودی اور عیسائی مفکرین سلبی الٰہیات پر یقین رکھتے تھے ۔ ایک معروف یہودی فلسفی اور مذہبی ماہر، موسیٰ ابن میمون (1135-1204) نے اپنی اہم فلسفیانہ الٰہیات کی کتاب "دلالۃ الحائرین" میں سلبی الہیات کا نظریہ واضح طور پر بیان کیا ہے۔ [3] ابن میمون کے خیال میں، سوائے منفی بیانات، جیسے "خدا جسم نہیں رکھتا"، اور کچھ بہت ہی عمومی جملے، جیسے "خدا موجود ہے" اور " تمام تبدیلیوں کی اصلی اور پہلی علت خدا کی ذات ہے"۔ کوئی بھی حقیقی یا مثبت جملہ اللہ تعالی کے لیے استعمال نہیں کیا جاسکتا۔ لہٰذا، ہم جو کچھ بھی خدا کے بارے میں استعمال کرتے ہیں اس کا ترجمہ مثبت الفاظ میں نہیں کیا جاسکتا۔ [4] ابن میمون، اس حقیقت سے واقف ہے کہ مسیحی تثلیث میں، تین ذاتین اور اقنوم واضح ہیں جبکہ خدا ایک ذات اور چند صفات پر مبنی ہے، کہتے ہیں: اگر کوئی ان ذاتی صفات کو عین ذات جانے اور دوسری طرف خداوند متعال کو بسیط سمجھے تو ایسی صورت میں ایک ہی ذات میں متعدد صفات ناسازگار ہوں گی، کیونکہ عینیتِ صفات، ذات بسیط کے ساتھ اس معنی میں ہے کہ اس میں ہر قسم کی کثرت کی نفی کی گئی ہے۔ [5]

خدا کی تنزیہ کی طرف یہ تمایل یہودیوں کے ذریعہ عیسائیوں میں پھیلا۔ **نکولس کوسا**(Nicholas of Cusa) کہتا ہے: "جو کچھ خدا کے بارے میں معلوم جاسکتا ہے وہ یہ ہے کہ وہ قابل شناخت نہیں" وہ، **اور جن**(Origen) کی طرح، خدا کو "ضد الاضداد" مانتا ہے [6] اور ان کا ماننا یہ ہے کہ یہ کہ دینی اور مذہبی مسائل زیادہ تر مثبت سخن کی وجہ سے پیدا ہوتے ہیں۔ مذہبی اور متدیّن افراد، حق اور حقیقت کی بجائے انسانی نقشوں کی عبادت کرتے

آئے ہیں۔[7] چونکہ **کلیمینٹ (Clement)** کا عقیدہ یہ ہے کہ کوئی با معنی محمول ایسا نہیں جو خداوند متعال کے لئے مناسب ہو۔[8] لیکن سلبی الٰہیات میں سب سے نمایاں عیسائی شخصیت، پانچویں صدی کا شامی عیسائی جسے کاذب ڈائنیسیئس ((Pseudo – Dionysius)) کہتے ہیں کہتا ہے: "خداوند علی الاصول سلب و اثبات سے بالاتر ہے"[9] اللہ تعالی ناقابل بیان اور ناقابل ادراک ہے۔[10] عرفانی الٰہیاتِ میں اور ڈائنیسیئس نے اپنی مجموعہ آثار میں مختلف مقامات پر خداوند کو پوشیدہ اور متعال سمجھا ہے؛ کوئی زبان یا بولی بھی اس کی ذات کو سمجھنے کے لئے کافی نہیں اور امر متعال کی تلاش اس کی روئیت اور شناخت سے بھی بالاتر ہے۔ ان کے نظریے کے مطابق اللہ تعالی کے بارے میں کوئی اثباتی یا سلبی صفت بیان نہیں کی جا سکتی۔[11] البتہ وہ اثباتی الٰہیات پر سلبی الٰہیات کو ترجیح دیتے تھے۔

مسلم مفکرین

مسلمانوں میں بھی ایسے لوگ تھے جو ایسے نظریات رکھتے تھے، جیسے: ملارجب علی تبریز، جو لفظی اشتراک کے حامی ہیں۔ لفظی اشتراک کا مطلب یہ ہے کہ وجود اور موجود کا لفظ، ظاہری شکل میں، خالق اور مخلوق پر یکساں طور پر منطبق ہوتا ہے۔ اور اسی طرح لفظی اشتراک نہ صرف وجود میں، بلکہ دوسرے تمام کمالات کے مفاہیم میں بھی ہے۔ اسی موضوع نے انہیں سلبی الٰہیات کی طرف راغب کیا۔[12] رجب علی تبریز نے خدا کی صفات کا انکار کیا اور ان کا عقیدہ یہ تھا کہ نہ تو صفات واجب تعالیٰ کے لیے عین ذات ہیں نہ زائدِ ذات ہیں اور اللہ تعالی کی ذات ہر قسم کی صفت سے منزّہ اور مبرّہ ہے۔[13] شیخ رجب علی تبریز کے شاگرد قاضی سعید قمی، بھی سلبی الٰہیات کے بہت بڑے حامی ہیں۔ وہ لکھتے ہیں: "خداوند متعال کی اوصاف بیان کرنا ممکن ہی نہیں ہے، چاہے وہ سلبی ہو یا اثباتی ۔۔۔ اس کی صفت بیان کرنا کسی بھی طرح مناسب و معقول نہیں۔ اس سے ہٹ کر کہ ان اوصاف کو عین ذات یا غیر ذات جانیں۔"[14] قاضی سعید کے مطابق، اللہ تعالی، جیسے اپنی ذات میں تمام موجودات سے مختلف ہے، اپنی صفات میں بھی وہ مخلوقات سے جدا ہے۔ وہ کچھ آیات اور روایات کے مطابق، خالق اور مخلوق کے اشتراکِ وجود کو مسترد کرتے ہیں۔ اور شرح توحید صدوق میں بیان کرتے ہیں، "اگر خدا اپنی مخلوقات سے تناسب رکھتا، تو خدا بھی مخلوق کے زمرے میں آتے"۔[15] قاضی سعید اسی دلیل کو صفات کے بارے میں بھی قائم کرتے ہیں: "اگر خدا اپنی صفات میں مخلوق کے ساتھ سازگاری رکھتا، تو حکم کے مطابق عرض میں اشتراک سے معروض کا اشتراک لازم آتا ہے، اس صورت میں وہ اپنی ذات میں مخلوق کے ساتھ مشترک ہے۔ اور یہ بات عقل اور برہان کے تقاضے کے خلاف ہے۔"[16]

1۔آیا خدائی صفات کی پہچان ممکن؟

جہاں تک اس سوال کا تعلق ہے کہ آیا انسانی ذہن و فکر، الٰہی صفات کی پہچان اور ادراک حاصل کر سکتی ہے یا نہیں، تو اس حوالے سے استاد مرتضی مطہری کا نظریہ ہے کہ انسان خدا کی صفات کو جان بھی سکتا ہے اور وہ خدا تعالیٰ کی صفات میں کسی حد تک تحقیق بھی کر سکتا ہے۔ جیسا کہ ان کے مجموعہ آثار میں بیان ہوا ہے: "عام تصورات اور وجود کے عمومی تصورات کے ساتھ ذہن کی واقفیت ریاضی کے اہم یا فطری مسائل کو سمجھنے کے لئے کافی نہیں ہے، لیکن خاص الٰہی معاملات کو سمجھنے کے لئے کافی ہے۔ یہ کہ کون سی صفت، صفات کاملہ سے ہے اور اللہ تعالی کی ذات کے لئے مناسب ہے یا نہیں، وجود شناسی کے قاعدے کے ذریعے یہ بات قابل تحقیق ہے اور فلسفیانہ تربیت یافتہ عقل ایک خاص سطح تک اس بارے میں تحقیق اور تفتیش کی اہلیت رکھتی ہے۔"[17]

اس عبارت میں شہید مرتضی مطہری کی مراد قطعاً یہ نہیں ہے کہ ہم خدا کو مخلوقات سے تشبیہ دیں یا اس کو مخلوقات جیسا سمجھیں، یا بالخصوص اس جملے سے کہ (وجود شناسی کا قاعدہ) سے مراد ظاہری بدن نہیں، جو اس کے غیر کی طرف ہمارے اذہان کو مائل کرے، بلکہ اس کے جیسا کوئی ہے نہ اس کا کوئی ہمسر ہے۔ اور نہ ہی یہ اس معنی میں ہے کہ ہم اس کی ذات حقیقت کو پہچان سکیں۔ ہر گز انسان کی طاقت سے یہ بات خارج ہے۔ جیسا کہ شہید مرتضی مطہری خود فرماتے ہیں: "خدا کے جیسا کوئی نہیں۔ (لیس کمثلہ شیء) اس کی تشبیہ کسی چیز اور کسی بھی شخص سے نہیں کی جا سکتی، انسان کو اس ذات پاک کے ساتھ کیا نسبت، انسان اس بات پر قادر نہیں کہ اس ذات کی حقیقت اور صفات کو پہچان سکے"۔ ان کے خیال میں جب ہم کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کا کوئی ہم منصب نہیں ہے تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ ہم اس کی مخلوق کے لئے استعمال کردہ کسی بھی چیز، معانی اور صفات کا اطلاق خدا پر نہیں کر سکتے یا مخلوقات کے لئے استعمال ہونے والی کسی صفت کا خدا پر اطلاق نہیں کر سکتے۔ کیونکہ ہمارے اور خدا کے مابین فرق یہ ہے کہ وہ واجب ہے اور ہم ممکن ہیں، وہ قدیم ہے اور ہم حادث ہیں، وہ لامحدود ہے اور ہم محدود ہیں۔ مثال کے طور پر اللہ تعالی عالم ہے اور انسان بھی عالم ہے۔ علم کا مطلب بھی شناخت، آگاہی اور کشف کے سوا کچھ نہیں۔ فرق یہ ہے کہ خداوند کا عالم ہونا ضروری اور انسان کا عالم ہونا ممکن ہے۔ وہ قدیم العلم ہے اور انسان حادث العلم۔ وہ کلی و جزئی، گزشتہ و حاضر، ظاہر و غیب کا عالم ہے: لَا يَعْزُبُ عَنْهُ مِثْقَالُ ذَرَّةٍ (34:3) انسان بہت قلیل اور محدود حصے کا عالم ہے۔ اس کا علم بالذات اور اس کا علم بالغیر ہے۔ اللہ کے علم اور انسان کے علم میں فرق غیر متناہی اور متناہی کا ہے۔[18] درحقیقت، ہم اللہ تبارک و تعالی کے لیے اور انسان کے لیے بھی ان صفات کو استعمال کر سکتے ہیں لیکن ایک فرق کے ساتھ وہ یہ کہ مصداق کے اعتبار سے اللہ تعالی اور انسان کے درمیان بہت زیادہ فاصلہ ہے، ہم مقید

ہیں اور وہ مطلق ہے ہم محدود ہیں اور وہ لا محدود، باالفاظ دیگر انسان کی صفات کا احاطہ کیا جا سکتا ہے یا اس کی واقعیت کو جانا جا سکتا ہے لیکن پروردگار کی صفات کا احاطہ اور ان کے حقیقی معنی کے تہہ تک پہنچنا ہمارے بلکہ کسی ذی روح کے بس کی بات نہیں۔ لہٰذا ہم شہید مرتضی مطہری کے بیانات کی روشنی میں یہ کہہ سکتے ہیں کہ آپ الٰہی صفات کی پہچان کے باب میں مخلوقات اور خدا کی صفات کے درمیان اشتراکِ معنوی کے قائل ہوئے ہیں۔

البتہ یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب ہم مقید ہیں اور خداوند تعالیٰ کی ذات مطلق ہے تو یہ کیسے ممکن ہے کہ ہم اپنی محدود اور مقید فہم کے ذریعے اس ذات مطلق کی صفات کو پہچان سکیں؟ مرتضی مطہری اس بات معتقد ہیں کہ: " ہم ہمیشہ اپنی مادی زندگی میں جسمانی، زمانی اور مکانی قیود میں گرفتار ہیں۔ اسی وجہ سے ہم مطلق کو اور جو ان قیود سے پاک ذات ہے نہیں جان سکتے۔ لیکن اسی حالت میں ہم "مقید" کو بغیر "مطلق" کے تصور نہیں کر سکتے کیوں کہ ہر مقید چند مطلق اشیاء کا مجموعہ ہوتا ہے جن کے ذریعے ایک دوسرے کے ساتھ مقارنت اور تعلق قائم کرتے ہوئے اطلاق سے خارج ہوتے ہیں۔ مثال کے طور پر اگر کہا جائے: "چھوٹا سفید انسان" تو یہ ایک ایسا مقید ہے جو تین مطلق اشیاء سے وجود میں آیا ہے۔ تو لہٰذا ہم مطلق کو پہچانتے ہیں لیکن قیود میں"۔ اس مطلب کی مزید وضاحت کرتے ہوئے فرماتے ہیں: " یہی وجہ ہے کہ جب ہم مطلق کے بارے میں سنتے ہیں، اپنے ذہنی انس کے لئے ان مقید و مانوس اشیاء سے اس ذات کو تصور میں لاتے ہیں"۔ [19]

استاد مطہری کا عقیدہ یہ ہے کہ چونکہ ہمیشہ ہمارا سروکار مقیدات سے ہے اور ہم ان چیزوں سے مانوس ہیں جن کو ہم محسوس کر سکتے ہیں۔ اس بات کی وضاحت ایک مثال کے ذریعے سے دی جا سکتی ہے کہ اگر ہم ایک دیہاتی سے کہیں کہ اس دنیا میں ایک بہت بڑا " شنگھائی" نامی شہر ہے اس بات کو سنتے ہی وہ اپنے ذہن میں ایسے گاوں کی شکل تشکیل دے گا جو بہت زیادہ آبادی پر مشتمل ہے۔ لیکن ہمیں اس کو ساتھ یہ بھی سمجھانے کے لئے بتانا ہوگا کہ شنگھائی ایک بہت بڑی آبادی کا شہر ہے لیکن ان جیسی آبادیوں والے شہروں سے اس کا مقایسہ نہیں کیا جا سکتا۔

مختصرا یہ کہ ہم ہمیشہ مطلق کو نفی کے ذریعے پہچانتے ہیں، اس کی ذات مطلق ہے، لا محدود ہے بے نیاز ہے لہٰذا ہم معلول، قید اور نقص جیسے امور کو اس کی ذات پاک سے نفی کرتے ہیں تاکہ ہم مندرجہ بالا مفاہیم کو اس ذات کے بارے میں درک کر سکیں۔ اس وقت کہتے ہیں: اللہ تعالی موجود ہے لیکن وہ ان موجودات کی مانند نہیں ہے جو ہم بظاہر دیکھتے ہیں، نیز وہ قدرت، علم، حیات اور وجود رکھتا ہے لیکن اس کی تشبیہ دیگر موجودات کے علم، قدرت، حیات اور وجود کے ساتھ نہیں دی جا سکتی۔

2۔ کس قاعدے کے ذریعے ہم اللہ تعالی کی صفات کو پہچان سکتے ہیں؟

شہید مرتضی مطہری کا نظریہ ہے کہ اس سوال کا جواب دو طریقوں سے دیا جاسکتا ہے:

پہلا قاعدہ: اس قاعدہ و قانون کے مطابق اس کی ذات صفات پر دلیل واقع ہو گی؛ یہ وہی **برہان صدیقین** ہے، یعنی جب یہ ثابت ہو گیا کہ اصالت اور حقیقت اس کے وجود سے ہے، اور مستند ہو گیا کہ حق تعالی وجود محض اور واقعیت محض ہے اور اس کی ذات عدم اور ماہیت سے مبرا ہے، اور مصدقہ بات ہے کہ کمال وجود کے مساوی ہے اور عدم و ماہیت، نقص و عیب کا منشاء ہیں، تو اللہ تعالی حقیقی کمال کا مالک ہے، کیونکہ حقیقی کمال یہ ہے کہ حقیقت اور وجود کی طرف لوٹے، اور اس کا تعلق وجود اور واقعیت سے ہو، چونکہ ذات حق وجود محض ہے پس کمال محض ہے۔ درحقیقت، اس قاعدہ میں مرتضی مطہری نے صدر المتالہین شیرازی کے اللہ تعالی کے بارے میں دلائل میں سے اس دلیل کو اپنے مدعا کو ثابت کرنے کے لئے استعمال کیا ہے۔

دوسرا قاعدہ: اس قاعدے میں شہید مطہری دو ذیلی دلیلوں کے قائل ہوئے ہیں، اس دلیل میں مخلوق اس کے اوصاف کا آئینہ ہے:

الف: خالص فلسفی دلیل کے لحاظ سے: "یہ بات ناممکن سی ہے کہ کمال عطا کرنے والا خود اس کمال کا مالک نہ ہو۔" چونکہ ہم مخلوق میں کمالات کا ایک سلسلہ جیسے علم، قدرت، حیات اور ارادہ دیکھتے ہیں، لہٰذا یہ سلسلہ اس بات کی علامت ہے کہ موجودات کا منشاء اور مبداء، ان (تمام) کمالات کا مالک ہے۔ یہ دلیل تمام فلاسفرز کے نزدیک قابل قبول ہے اور یہ کیسے ممکن ہو سکتا ہے کہ جو کوئی بھی ایک کمال کا دینے والا اور عطا کرنے ہو اور وہ خود اس ملکہ یا اس کمال سے محروم ہو اس بات کو عقل سلیم تسلیم نہیں کرتی، تو لہٰذا ضروری ہے کہ وہ ذات بھی ان تمام اوصاف و صفات کا مالک و صاحب ہو جیسے علم، قدرت۔۔۔۔ وغیرہ۔

ب: دوسری دلیل جسے علم کلام کے ذریعے ثابت کیا جاسکتا ہے: یہ جو ہم اتنا منظّم اور زبردست نظام کائنات دیکھ رہے ہیں یہ محض ایک اتفاق نہیں ہے بلکہ اس میں علم، ارادہ و تدّبر سے کام لیا گیا ہے؛ اور چونکہ وہ ارادہ و علم، فاعل میں ہے، تو قدرت بھی ہے، کیونکہ قدرت تو اس کو کہتے ہیں کہ جب فاعل چاہے اپنے فعل یا کام کو انجام دے دے؛ اسی دلیل کی بنا پر وہ زندہ بھی ہے کیونکہ زندگی بھی اس کے علاوہ تو کچھ نہیں کہ موجود فعّال اور درک و فہم کرنے والا ہو۔[20] اس سے یہ واضح ہے کہ مرتضی مطہری برہان نظم کے قائل ہیں، جو کہ کلامی استدلال ہے اس استدلال و برہان کو علم کلام میں بہت اہمیت حاصل ہے اور جس کے ذریعے خداوند متعالی کے وجود اور اوصاف کو ثابت کیا جاتا ہے۔

البتہ ان قاعدوں پر ایک اعتراض و اشکال وارد ہوتا ہے وہ یہ کہ ان میں یہ تو ثابت ہو رہا ہے کہ خالق نے یہ کمالات مخلوق کو عطا فرمائے ہیں اور اس ذات کے پاس یہ کمالات بدرجہ اتم پائے جاتے ہیں لیکن یہ اس بات پر قطعاً دلالت نہیں کر رہا کہ ذات حق کمال مطلق ہے۔ اس اعتراض کے جواب میں مرتضیٰ مطہری فرماتے ہیں:
اگر ہم برہان کی دوسرے جانب دیکھیں تو اس خداوندعالم جو وجود اور ہستی دینے والی ذات ہے ، اس کے لیے ضروری ہے کہ جو علت فاعلی ہے وہ صاحب کمال ہونی چاہیے تاکہ وہ معلول کو یہ صفت دے سکے، یہ اس بات کا لازمہ ہے کہ جو ہستی بخشنے والی ذات ہے وہ تمام کمالات کی مالک ہو۔[21]
شہید مرتضیٰ مطہری کی عبارت سے جو بات آشکار ہوئی وہ یہ ہے کہ جو فاعل علت ہے وہ تمام کمالات کا مالک ہو تاکہ وہ معلول کو دے سکے۔ تو یہی چیز اس کے صاحب کمالات ہونے پر دلالت کرتی ہے کیونکہ وہ کمال کو بخشنے والا ہے، اگر وہ صاحب کمال نہ ہو تو وہ کیسے دوسروں و یہ کمالات دے سکتا ہے۔ وہ مزید فرماتے ہیں: "اگر ہم خداوندِ عالم کو ‹‹برہان›› کی اس جانب دیکھیں تو واقعیت مطلق اسی ذات سے ہے تو لہٰذا ضروری ہے کہ سارے کمال اور حقیقت بھی اسی کی ہی ہو گی۔ مثلاً اس جہان کے جو موجودات ہیں ان میں جو بھی فعالیت و قدرتِ عمل دیکھی جا سکتی ہیں وہ ان کی زمانی اور مکانی شرائط کی حد تک محدود ہیں۔ البتہ اس کی فعالیت اور قدرتِ عمل، اس قدرت سے ہی ہے جو مذکورہ بالا قدرت میں ہے۔"[22] اس بحث سے ہمیں یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ موجودات بھی کسی نہ کسی سرگرمی اور فعالیت پر قادر ہیں لیکن وہ قدرت عمل جو ان میں پائی جاتی ہے وہ اس کون و مکان کی قید میں جکڑی ہوئی ہے لیکن واقعیتِ مُطلقہ اسی ذات پروردگار کی ہے ۔اب یہ اس بات کا لازمہ ہے کہ وہ ذاتِ حقیقی ان تمام کمالات مطلقہ کی مالک ہونی چاہیے تاکہ تمام مخلوقات کو عطا کر سکے۔ مطہری ایک اور جگہ فرماتے ہیں :چونکہ یہ قدرت کمالی ہے اور واقعیت پر مبنی ہے تو لہٰذا واقعیت مطلق سے (وجود خدا) سلب نہیں ہو سکتا اور یہ قدرت ہے جو علت سے وجود میں آئی ہے . درحقیقت اس کی علت فاعلی ان تمام کی مالک ہونی چاہیے۔

3۔ کیا خداوند متعال کو صفات ثبوتیہ کے ذریعے متصف کیا جا سکتا ہے؟

استاد مرتضیٰ مطہری کا عقیدہ یہ ہے کہ انسان کی عقل اپنی توانائی اور قدرت کے مطابق ایک خاص حد تک ان صفات کو فہم و درک کر سکتی ہے۔ جو صفت خداوند متعال کے لیے کہی جاتی ہیں وہ اس معنی میں ہیں کہ وہ اس ذات میں بمعنی اتم موجود ہیں۔ ان کے مطابق: "علم، قدرت، حیات اور ارادہ وغیرہ جیسی صفات، صفات ثبوتیہ میں سے شمار ہوتی ہیں"[23] تو اس بنا پر یہ کیسے ممکن ہے کہ کمال دینے والی ذات خود اس کمال سے محروم ہو یا اس میں وہ کمال بدرجہ اتم نہ پایا جاتا ہو۔ شہید مرتضیٰ مطہری ان افراد کے ان سوالوں کے جواب میں جو اس بات کے قائل ہوئے ہیں کہ جو صفت بھی انسان کو خدا سے مشابہ و مانند کرے، اس سے خداوند متعال منزہ ہے یا وہ اس صفت کو اللہ

تعالی سے تنزیہ کرتے ہیں۔ فرماتے ہیں: " یہ بات تو اظہر من الشّمس ہے کہ اگر ہم ایسے نظریہ کے قائل ہو جائیں تو نہ صرف یہ بات لازم آئی گی کہ حق تعالی سب صفات سے مبرّہ ہے بلکہ یہ اس بات پر بھی دلالت کرتا ہے کہ عقل اس کو پہچان نہیں سکتی اور اس سے ارتفاع نقیضین[24] لازم آتا ہے، در حقیقت یہ ایک طرح کا اللہ کی وحدنیت کا انکار ہے۔ "[25]

میری نظر میں شہید مطہری اس بات کے قائل ہیں کہ اگر ہم یہ مان لیں کہ خداوند تعالی کی ذات کے لئے صفات ثبوتیہ کا قائل نہیں ہوا جا سکتا تو فی الواقع ہم یہ بات مان رہے ہیں کہ وہ ذات ان تمام صفات سے عاری ہے اور کوئی بھی صفت اس میں نہیں پائی جاتی۔ با الفاظ دیگر، وہ ذات بغیر صفات کے ہے یعنی وہ واجب الوجود ذات جو معطی صفات و کمال ہے وہ ان کی فاقد ہو، یہ بات سالم ذہن قبول نہیں کر سکتا اور یہ بات محال ہے۔ یہاں یہ سوال بجا طور پر ایجاد ہوتا ہے کہ اگر یہ قاعدہ کلیت رکھتا ہے کہ خدا نے جس چیز کو جو بھی خصوصیت اور صفت عطا کی ہے، وہ خصوصیت اور صفت خود خداوند تعالی کے وجود میں بھی پائی جانی چاہیے تو آیا اس کا مطلب یہی ہے کہ مثلاً یہ کہا جائے کہ اللہ تعالی نے جسم کو بنایا ہے تو اس ذات میں بھی جسم اور جسم کی تمام خصوصیات پائی جانی چاہیں؟

مرتضی مطہریؒ اس مسئلہ کا جواب کچھ یوں دیتے ہیں کہ: "تمام امکانی موجودات جو ظاہر میں ایک وجود رکھتے ہیں، وجود اور ماہیت سے بنے ہیں۔ مثلاً اگر موجود کا جسم اس کے وجود جسمانیت کے ساتھ محدود نہ ہوتا تو وہ وجود مطلق ہوتا؛ لیکن جسمانیت یعنی مادی جوہر جو حجم رکھتا ہو، یہ وجود مطلق کو محدود کرتا ہے اور زمانی اور مکانی قیود کے نزدیک لاتا ہے۔"[26] ان کے نظریہ کے مطابق ساری دنیاوی اشیا مادے اور جوہر میں مقید ہیں اور اگر یہ زمانے اور مکان کی قید سے جارج ہو جاتیں تو اس وقت یہ مطلق کہلاتے ہیں، تو جو بھی وجود ان چیزوں کی قید سے ملا جاتا ہے وہ جسم کہلاتا ہے۔ مزید وضاحت کرتے ہوئے فرماتے ہیں: " علت فاعلی ہمیشہ اپنے حال کے مطابق مطلق تاثیر پہنچاتا ہے لیکن اپنی زمانی اور مکانی شرائط کے مطابق اس ذات کے اطلاق کو لیتا ہے۔ ایسے ہی جیسے ایک شخص جو دریا سے پانی بھرنا چاہے وہ پانی کو محدود نہیں کر سکتا بلکہ اس کے ہاتھوں اور برتن جو اس کے ہاتھوں میں ہے، دریا کے پانی کے اجزاء کی دوری اور نزدیکی، اس کے فعل کو مقید کر دیتا ہے۔"[27]

ان کے نظریہ کے مطابق زمانی و مکانی قیود ہمیں اس کے وجود مطلق کے سمجھنے میں مانع آتیں ہیں جبکہ مطلق بذات خود مطلق ہے اور کسی بھی اعتبار سے مقید نہیں ہو سکتا۔ اس کی ذات ہر قید او بند سے مبرّہ و منزّہ ہے۔ اسی مطلب کو وضاحت کے ساتھ بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں: "ہر مقید در حقیقت معدوم ہو جاتی ہے اور خداوند متعال جو وجود مطلق ہے، عدم و نابودی سے اس کی ذات مبرہ ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں ہم اللہ تعالی کو ایسی مربوط صفات سے جو اس کی ذات سے خارج ہیں متصف کرتے ہیں، جیسے: وہ خدا، خالق، رزق دینے والا، زندگی دینے والا، موت دینے

والا، پیدا کرنے والا اور رب ہے۔ لیکن در حقیقت یہ اوصافِ نسبی ہیں خارجی وظاہری نہیں ہیں۔"[28] جب ایسی صفات جو اللہ تعالی کی جانب منسوب کی جارہی ہوں جو کسی بھی اعتبار سے محدود ہوں تو وہ معدومیت کے طرف لوٹتی ہیں اور شہید مرتضی مطہریؒ کے نزدیک ایسے اوصاف سے خداوند تعالیٰ کی ذات منزہ ہے۔

4۔ کیا خداوند متعال سے کچھ اوصاف کو سلب کیا جاسکتا ہے؟

شہید مرتضی مطہریؒ کے عقیدہ کے مطابق ہم ایسی صفت یا اوصاف کو سلب کر سکتے ہیں کہ جو اس ذات میں کثرت یا مرکب ہونے کے عنصر کو ظاہر کرتی ہوں یعنی جو صفات اللہ تعالی کی ذات کو اطلاق سے یالا محدودیت سے غیر مطلق یا محدود مقید کی جانب لاتی ہوں ان کو اس ذات سے سلب کیا جاسکتا ہے: " توحید ذاتی سے مراد اس ذات سے دو کی نفی، مثل کی نفی اور مانند ہونے کی نفی کرنا ہے۔ اور توحید صفاتی سے مراد اس ذات سے ہر طرح کی مرکب ہونے اور کثرت کی نفی ہے۔ بالکل اسی حال میں جب اللہ تعالی کی ذات جمال وجلال، کمالیت کے اوصاف سے متصف ہے، اس میں ظاہری اعتبار سے کوئی اختلاف نہیں پایا جاتا۔ ذات کا صفات سے مختلف ہونا اور صفات کا آپس میں ایک دوسرے سے جدا ہونا وجود کو محدودیت کی جانب لے جاتا ہے۔ بے انتہا ولا محدود وجود کے لے "دوسرا" کوئی تصور میں نہیں لایا جاسکتا تو مرکب ہونا، کثرت، ذات اور صفات میں اختلاف بھی تصور میں نہیں لایا جاسکتا۔"[29]

اس بناپر ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ شہید مطہریؒ کا عقیدہ یہ ہے کہ وہ خداوند متعال سے ہر طرح کی محدودیت، کثرت، مرکب ہونا یا کسی کے جیسا ہونے کی نفی کرتے ہیں۔ اگر ان چیزوں مان لیا جائے تو یہ چیزیں باعث بنتی ہیں کہ وہ چیز محدود یا مقید ہو جائے بلکہ یوں کہنا مناسب ہوگا کہ وہ ہر چیز ہو سکتی ہے خدا نہیں ہو سکتا۔

نتیجہ:

صفات خداوندی کی شناخت کے بارے میں شہید مطہریؒ کے نظریہ کا خلاصہ یہ ہے کہ:

1. انسانی عقل ایک حد تک قادر ہے کہ وہ اوصاف الٰہی کو درک کر سکے۔ اس سے آگے چونکہ انسان محدود ہے اس لئے وہ اس ذات کو پہچاننے کی طاقت نہیں رکھتا۔
2. صفات خدا کی شناخت کے دو راستے ہیں: پہلا، برہان صدیقین کے ذریعے اور دوسرا، صفات کے ذریعے۔
3. خدا کی صفات کی شناخت کے دو طریقے ہیں: الف: فلسفی۔ ب: کلامی۔
4. ایجابی صفات یا صفات ثبوتیہ کے ذریعے خدا کو توصیف کرنے میں اشکال نہیں۔
5. جو صفات خداوند متعال کی ذات میں کسی قسم کا نقص یا عیب ظاہر کرتی ہوں انہیں خداوند تعالی کی ذات سے سلب کیا جاسکتا ہے۔

*****

حوالہ جات

1۔امیر عباس، علی زمانی، *سخن گفتن از خدا* (تہران، سازمان انتشارات پژوہشگاہ فرہنگ واندیشہ اسلامی، 1387ش) 93۔

2۔ فخر الدین، رازی، *المطالب العالیۃ من العلم الاہی* (بیروت، ارالکتاب العربی، 1407ق) 37۔

3۔ موسی، ابن میمون، *دلالۃ الحائرین*، تحقیق حسین آتای (آنکارا، مکتبۃ الثقافۃ الدینیۃ، 1972) 140۔

4.Ross, James, "Religious Language" in: *An introduction to the Philosophy of Religion*, Ed by Brian Davies, Oxford University Press, 1993), 108 ; Dan R, Stiver, *The Philosophy of Religious Language*, (Blackwell, Oxford, 1996.),19

5۔غلام حسین، دینانی، *نیایش فیلسوف* (مشہد، دانشگاہ علوم اسلامی رضوی، 1377)، 352۔

6.Dermot, Moran, "Platonism, Medieval", in: *Routledge Encyclopedia of philosophy*, vol. 9. (1998), 437.

7۔ محمد، ایلخانی، *تاریخ فلسفہ در قرون وسطی ورنسانس* (تہران، ندارد، سمت 1382)،553۔

8.Kenny, John Peter, "Patristic philosophy", in: *Routledge Encyclopedia of philosophy*, vol. 7, (London, Routledge, 1998), 257

9.Payn, Steven, "mysticism", in:*Routledge encyclopedia of philosophy*, vol. 6, (London, Routledge, 1998), 624

10۔ کریم، مجتہدی، *فلسفہ در قرون وسطی* (تہران، امیر کبیر 1379)،110۔

11.Ross, James, "Religious Language" in: *An introduction to the Philosophy of Religion*, Ed by Brian Davies, (Oxford University Press, 1993), 109-110. Stiver, Dan R. *The Philosophy of Religious Language*, Blackwell, (Oxford, 1996), 17.

12۔امیر عباس، علی زمانی، *سخن گفتن از خدا*؛178۔

13۔ غلام حسین، دینانی، *نیایش فیلسوف*؛ 345۔

14۔ قاضی سعید، قمی، *کلید بہشت*، مقدمہ و تصحیح محمد مشکات (تہران، الزہرا، 1362)،66۔

15۔ قاضی سعید، قمی، *شرح توحید الصدوق*، تصحیح و تعلیق نجفقلی حبیبی، ج1 (تہران، وزارت فرہنگ وارشاد اسلامی1373)،10۔

16۔ قمی، *شرح توحید الصدوق*، ج1،8۔

17۔ مرتضٰی، مطہری، *مجموعہ آثار*، ج6، (قم، انتشارات صدرا) 1035۔

18۔ایضا : 1034۔

19 ۔ایضا: 1004تا1012

20۔ایضا:1041و1042

21۔ایضا:1029

22۔ ایضا:1032

23 ۔ایضا،ج2/ 94۔

24۔ علم منطق کی اصطلاح ہے جو ممکن الوجود کے بارے میں استعمال ہوتی ہے اور اس سے مراد یہ ہے کہ نہ وجود اس کے لئے ضروری ہے اور ان عدم اس کے لئے ضروری ہے. اس صورت میں ہم اس بات کے قائل ہو جاتے ہیں کہ ممکن ہے وہ ذات موجود ہو اور ممکن ہے وہ ذات موجود نہ ہو. لہٰذا یہ نقیضین ہیں۔

25۔ مرتضٰی، مطہری، مجموعہ آثار، ج6: 1034

26۔ایضا: 1045

27۔ایضا۔

28۔ایضا۔

29۔ایضا، ج2: 101

کتابیات

1. ابن میمون، موسی، *دلالۃ الحائرین*، تحقیق حسین آتای، آنکارا، مکتبۃ الثقافۃ الدینیۃ، 1972۔
2. ایلخانی، محمد، تاریخ فلسفہ در قرون وسطی ورنسانس، تہران، سمت 1382۔
3. دینانی، غلام حسین، *نیایش فیلسوف*، مشہد، دانشگاہ علوم اسلامی رضوی، 1377۔
4. رازی، فخر الدین، *المطالب العالیۃ من العلم الالہی*، چاپ اوّل، بیروت، ارالکتاب العربی، 1407ق۔
5. علی زمانی، امیر عباس، *سخن گفتن از خدا*، چاپ دوم، تہران، سازمان انتشارات پژوہشگاہ فرہنگ و اندیشہ اسلامی، 1387ش۔
6. قمی، قاضی سعید، *شرح توحید الصدوق*، تصحیح و تعلیق نجفقلی حبیبی، تہران، وزارت فرہنگ وارشاد اسلامی 1373۔
7. قمی، قاضی سعید، *کلید بہشت*، مقدمہ و تصحیح محمد مشکات، تہران، الزہرا 1362۔
8. مجتہدی، کریم، فلسفہ در قرون وسطی، تہران: امیر کبیر، 1379۔
9. مجموعہ آثار استاد شہید مطہری، (مجموعہ نور کا سافٹ ویئر)۔
10. Ross, James, “Religious Language” in: ***An introduction to the Philosophy of Religion***, Ed by Brian Davies, Oxford University Press, 1993.
11. Payn, Steven, “mysticism”, in: ***Routledge encyclopedia of philosophy***, vol. 6, London, Routledge, 1998.
12. Stiver, Dan R. ***The Philosophy of Religious Language***, Blackwell, Oxford, 1996.

معاشرتی ترقی میں ادب کا کردار

R0LE OF LITERATURE IN SOCIAL DEVELOPMENT

Dr. Ansaruddin Madani
Dr.Faza Muslim

Abstract:

Man naturally takes intrest in poetry and literature. In fact, literature etiquette is elegant jewelry for a man. Although there are not the real tastes of an individual's physical beauty in poetry & literature but, it is the aspect of inner beauty of a person with which he not only beautifies himself but also his society. So literal people can play a better role in the society for wellbeing and with the strength of the character they can make individuals the subject to social obligations. For this sake, Urdu language & literature can also play an excellent role in an individual's life for the building and betterment of a better society. Therefor, it is fundamental to develop Urdu literature and sustain it.

Keywords: *Literature, Urdu, Development, Culture, Beauty, Society.*

خلاصہ

اس مقالہ میں مقالہ نگار نے معاشرتی ترقی میں ادب کے کردار کو اجاگر کیا ہے۔ ان کے مطابق، انسانی فطری طور پر شاعری اور ادب میں شغف رکھتا ہے۔ دراصل، ادب انسانی تہذیب کا زیور ہے۔ اگرچہ ادبیات میں مادی حسن نظر نہیں آتا لیکن یہ انسان کے باطنی حسن کا آئینہ دار ہیں۔ ادیب اپنے باطنی حسن کی جلوہ گری کے ذریعے اپنے معاشرے کی اصلاح کر سکتا ہے اور معاشرے میں اعلی انسانی اور اخلاقی اقدار کو پروان چڑھا سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اردو زبان و ادبیات ہمیشہ ایک خاص اہمیت کی حامل رہی ہیں۔ بنا بریں، معاشرتی اصلاح اور ترقی کے دعویداروں کو نہ فقط اردو ادبیات کو پروان چڑھانے، بلکہ اسے پائیدار رکھنے کی ضرورت ہے۔

کلیدی کلمات: ادب، اردو، ترقی، تہذیب، حسن، معاشرہ۔

معاشرہ اور ادب

ادب افراد اور اقوام کی فکری اور نظریاتی تشکیل میں اہم کردار ادا کرتا ہے۔ ادیب معاشرے کا دماغ ہوتا ہے اور ان خیالات کا مظہر ہوتا ہے جو کہ ایک معاشرے میں پائے جاتے ہیں۔ انہی خیالات کو ادیب ایک سانچے میں ڈال کر حسین پیرایا عطا کرتا ہے۔ یہی ادیب کبھی انسانوں کی صورت میں معاشرے کی تصویر کشی کرتا نظر آتا ہے اور یہی اس کا حسن بیان اور اس کی شناخت بن جاتا ہے۔ وہ اپنے تجربات اور احساسات کو لے کر اپنی تہذیب وثقافتی اقدار کو ہمیشہ پیش نظر رکھتا ہے اور جب یہی ادیب اپنے اوپر شاعری کا لباس پہنتا ہے۔ تب ہی اس کی سوچ کا محور اس کی تہذیبی اقدار ہوتی ہیں۔ اس کا مقصد نظم یا نثر دونوں صورتوں میں افراد واقوام کی فکر و نظریا کارفرما ہوتا ہے اور جب یہی نظم صوفیانہ شاعری کا رنگ اختیار کرلے تو اس میں اعلیٰ انسانی اقدار کے ساتھ ساتھ مقصد کے معنی بھی سمائے ہوئے ہوتے ہیں۔ پھر جیسے ہی قصوں اور کہانیوں داستانوں کو عامحفل اور مجالس میں بیان کرنے کا سلسلہ شروع ہوا تو دلچسپی کے ساتھ سننے کا سلسلہ وسیع تر ہو گیا اور پھر گیتوں اور داستانوں کی بھی اہمیت میں اضافہ ہوا۔ اگر ہم یہ کہیں کہ ادب براہ راست ہماری زندگی سے تعلق رکھتا ہے تو بے جانہ ہوگا۔

کیونکہ ادیب ایک عظیم تہذیبی وثقافتی روایت کا علمبردار آزادی اور اخوت کا پرستار رہا ہے۔ ہمیشہ آگے کی طرف قدم بڑھاتا، اپنی قدروں کی پرستش کرتا اور انسانی محبت کے گیت گاتا ہوا، اقدار کیر کے نغمے سناتا نظر آتا ہے۔ یہ ادیب ہی ہے جو اپنے قلم سے خیالات اور واقعات کی تصویر کشی کرتا ہے۔ ہم خوش قسمت ہیں کہ پاکستان کی سرزمین پر کئی نامور ادیبوں، شاعروں اور افسانہ نگاروں نے جنم لیا ہے جو عالمی سطح پر اس ملک کی پہچان ہیں۔ مگر گزرتے وقت کے ساتھ ایسا بھی ہوا بقول ڈاکٹرانعام الحق کوثر: ''آج کل تو کچھ ادیب ایسے ہیں جو اپنے آپ کو ادیب ظاہر کرتے ہیں نمود ونمائش ان کا شیوہ ہے تکلف وتصنع ان کا شعار ہے یہ لوگ الٹی سیدھی چیزیں لکھ کر ادیبوں کی صف میں اپنی جگہ بنانے کے خواہش مند ہیں ظاہر ایسے ادیبوں کی تحریروں میں کوئی تجربہ نہیں ہوتا وہ تو محض شہرت حاصل کرنے کے خیال سے ادب کو اختیار کرتے ہیں''۔[1]

یہ حقیقت ہے کہ گذشتہ چند سالوں سے ادب کے نام پر جو تماشے ہو رہے ہیں اس کی وجہ سے ایک بے حسی کا عالم طاری ہے وہ ادیب جن کی تحریروں میں کوئی حقیقت پر گہرا اثر پڑھتا ہے لوگوں کے اوپر اب کوئی اثر نہیں ہوتا اب ایسی محسوسات بالکل ناپید ہیں۔ مثلاً پرانے لکھنے والوں میں بیگم عبدالحفیظ کا ناول تہنیت جو کہ ۱۹۵۹ء میں منظر عام پر آیا۔ خورشید عبدالحفیظ کا یہ ناول بڑے خوبصورت انداز میں معاشرے کے عیوب و نقائض کو بیان کرتا ہے۔ انہوں نے اس ناول میں ہندوستان کے مسلمانوں کی داستان زوال اور دور حاضر کی تعلیمی اور سیاسی جدوجہد کا آغاز کو

افسانے کی شکل میں پیش کیا۔ مصنفہ ایک جگہ لکھتی ہیں: ارے میاں باادب، بانصیب، بے ادب، بے نصیب۔ بزرگوں کی بات کا بُرا نہیں ماننا چاہیے وہ خواہ کچھ بھی کہیں وہ بزرگ ہیں۔ انہیں حق ہے۔ تمہاری سعادت مندی کا تقاضہ یہ ہے کہ تم سب کچھ برداشت کرو اور چپ رہو، اس میں تمہاری بڑائی اور اس سے خدا اور اس کے رسول خوش ہوتے ہیں۔ خوشحالی آتی ہے۔ [2]

اس پیراگراف میں مصنفہ نے اتنے خوبصورت انداز میں ایک اسلامی قدر کو اجاگر کیا ہے کہ بڑوں کے آگے خاموشی اختیار کرو۔ ادب کا تقاضہ ہے کہ انسان اپنے بڑوں کے آگے زبان درازی نہ کرے اس سلسلے میں سرورکائنات حضرت محمد ﷺ کا ارشاد گرامی ہے کہ: جوانی میں کیے گئے ہر عمل بڑھاپے کی نسبت دوگنا اجر ہے۔ [3]

بیگم خورشید لکھتی ہیں کہ: "ہمارا تعلق بھی شاہی خاندان سے ہے، چنے کے ساتھ گھن بھی پسے گا ہم پر بھی مصیبت آئے گی جس طرح پیڑیوں سے سارا کنبہ ساتھ رہا اب بھی ساتھ میں مرے گا اور جئے گا۔ چند لوگوں کے حسرت و یاس سے دل کا جائزہ لیا، دل نے کہا تیرا وطن اس کے سوہنی مٹی دریاؤں کا میٹھا پانی معتدل نرم و نازک ہوائیں، لہلہاتے کھیت، آزادی، پیاری آزادی، کندن کی طرح دمکنے لگے"۔ [4]

اس کا مطلب یہ ہے کہ انسان جہاں رہتا ہے اس جگہ سے انسان کو محبت ہوتی ہے۔ یہ صفت تو جانوروں میں بھی پائی جاتی ہے کجا انسان۔ مگر جب بات آزادی کی ہو جہاں سب کچھ اس کا اپنا ہو۔ اپنی مرضی سے سانس لینا ہو، تو اس آزادی کی خاطر انسان سب کچھ چھوڑنے پر راضی ہو جاتا ہے۔ اسلام میں اس کی مثال ہجرت کی صورت میں موجود ہے کہ جب حضور اکرم ﷺ اور آپ ﷺ کے اصحاب پر جب ظلم و ستم کی حد بڑھ گئی تو آپ ﷺ نے ہجرت کا حکم دیا۔ اور آپ ﷺ سمیت سب نے ہجرت کی آزادی کی خاطر ہجرت کرنا ہماری ایک قدر ہے اور یہ قدر ہمارے اقدار میں شامل ہے۔

اسی طرح وحیدہ نسیم کا ناول شبو رانی بھی بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ ۱۹۷۶ء میں یہ ناول منظر عام پر آیا، اور چھا گیا۔ یہ ناول بیک وقت رومانوی بھی ہے اور تاریخی بھی مصنفہ نے محبت کو اپنی اقدار کی پاسداری کرتے ہوئے بڑے حسین انداز سے لکھا ہے۔ شبو رانی ایک نازک اندام لڑکی ہے جو ڈگری یافتہ نہ ہونے کے باوجود ہمارے معاشرے کی جان ہے، یہ ایک تہذیب یافتہ کردار ہے، اس کردار نے نسوانیت کو معراج پر پہنچایا۔ ایک عورت جسے اسلام اپنی حدود میں رہ کر آزادی دیتا ہے۔ اس کردار نے اپنی حدود میں رہ کر کردار کو منوایا ہے اور پھر عاشق و معشوق کی اعلیٰ اقدار کو متعارف کرایا ہے اور انسان کو کسی بھی معاملے میں خود غرض نہیں ہونا چاہیے۔ مصنفہ لکھتی ہیں:

"ارے ممتاز آج تم، ناشتہ تیار کر رہی ہو، ہاں رحمان کو بخار ہے، وہ تو ایک ہفتے سے بیمار ہے، لیکن یاسین کہاں ہے؟ وہ بھی کل رخصت ہو گئے۔ آپ چلیئے میں ابھی ناشتہ لاتی ہوں۔ ممتاز نے مسکرا کے کہا اور خالد سمجھ گئے کہ اس

وقت باورچی خانے میں اس کا ٹھہرنا مناسب نہیں۔ اس لئے وہ صحن طے کرتا ہوا دالان میں آیا جہاں اس کے ماموں اخبار پڑھ کر اس کو تہہ کر رہے تھے اور ممانی جان وظیفے سے فارغ ہو کر جائے نماز کا کونہ الٹ رہی تھیں"۔ [5]

یاسین اور رحمان کا کردار گھر کے ملازمین کا ہے مگر اس میں ایک احساس اجاگر ہے کہ بیشک وہ ملازم ہیں مگر ان کی تکلیف کو محسوس کیا گیا ہے ہمارا دین ومذہب بھی اسی بات کی تاکید کرتا ہے کہ انسانیت کا احترام سب پر لازم ہے وہ احساس اس ناول میں نظر آرہا ہے۔ پھر نماز کا پڑھنا اس کی اہمیت کو بھی اجاگر کر رہا ہے کہ گھر کے بزرگ صبح دیر تک عبادت الٰہی میں مشغول رہتے ہیں۔ اس منظر میں ایک مسلم گھرانے کی تہذیب اجاگر ہو رہی ہے۔ دراصل، ہماری مشرقی تہذیب کا خاصہ ہے کہ جب لڑکا اور لڑکی کی نسبت طے ہو جائے تو ان کے درمیان جب تک شادی نہیں ہو جاتی، ایک لحاظ آجاتا ہے۔ یہی لحاظ ہماری تہذیبی قدر ہے، اور اسی قدر کو مصنفہ نے اجاگر کیا ہے۔ "ارے بیٹا! تم نے شبورانی کو دیکھا ہے؟ سنتی ہوں بڑی خوبصورت ہے۔ ممانی جان نے کمرے میں آکر پوچھا اور ممتاز کے قدم جاتے جاتے رک گئے، ہو گی خوبصورت، اتنا تو میں نے بھی دیکھا ہے۔ خان بہادر صاحب کا گھرانہ قدیم ہے، اور پردے کا سخت پابند ہے۔ پردے کا پابند ہے! عجیب بات ہے حالانکہ بڑے گھروں میں بلعموم پردہ زیادہ نہیں ہوتا۔ دیکھتے نہیں، زمانے میں کتنی فیشن کی ہوا چلی ہے"۔ [6]

انسان کتنا ہی ترقی کی منازل طے کرے مگر اسے اپنی روایات کو برقرار رکھنا چاہیئے اور یہی روایات اس کا قیمتی اثاثہ ہوتی ہیں۔ اپنی روایات کی بدولت اس کی پہچان ہے اسی طرح پردہ بھی ہماری روایات کا حصہ ہے۔ ہماری تہذیبی روایات میں مردان خانہ اور زنان خانہ موجود ہے۔ مگر وقت کے بڑھتے سائے اس روایت کو فراموش کر چکے ہیں۔ مگر ادیبوں نے اپنی تحریروں میں نئی تہذیب کو ہی موضوع سخن بنایا ہے کہ ہماری تہذیب کیوں کر ایک بہترین تہذیب بن سکتی ہے۔ یہ تمام اقدار کہ جو ہماری معاشرت میں شامل ہو کر زندگی کو ایک حسن بخشتی رہی ہیں ہمیں دوسری تہذیبوں سے ممتاز کر رہی ہیں۔ رات کا سناٹا بار بار اس کو شبورانی کے الفاظ یاد دلاتا رہتا ہے کہ:

"جب آپ تنہا ہوتے ہیں تو کبھی اس تنہائی میں غور کریں جب کوئی اور پاس نہیں ہوتا تو آدمی کے دل کے اندر چھپا ہوا انسان جاگ اٹھتا ہے جس کو روز اول فرشتون نے سجدہ کیا۔ اگر ہو سکے تو اس کی آواز سنئے، وہ آپ کو فرش سے اٹھا کر عرش تک لے جائے گا۔ انسان اگر انسانیت کے مرتبے سے گر جائے تو اس کی ہستی ایک مشت خاک سے کچھ زیادہ نہ رہے جس کو اڑا کر منتشر کرنے کے لئے ہوا کا ایک ایک جھونکا کافی ہے"۔ [7]

شاید یہی طرز فکر تھا جس نے خالد کو کبھی راہ سے بے راہ ہونے دیا۔ پاکستان سے والہانہ محبت اور قائداعظم سے دیوانہ وار عقیدت یہی وہ شیئ تھی جس کے سہارے وہ زندہ تھا۔ ورنہ ماحول اس کے لئے سازگار نہ تھا۔ وہ کبھی قدم قدم پر کھلے انگریزی اسکول کو دیکھتا اور کبھی ان بچوں کو دیکھتا جو اپنی تہذیب سے بیگانہ تھے اور کبھی مقدس درسگاہوں

میں رقص کے مظاہروں کو دیکھتا تو گھنٹوں سوچتا کہ آخر یہ ہمارے طبقے کی تہذیب ہے جو عام ہو رہی ہے۔ آج ہماری تہذیب جس ڈگر پر چل رہی ہے۔ قائداعظم نے کبھی ایسا سوچا بھی نہ ہوگا کہ وہ ملک جس کو اتنی کوششوں اور قربانیوں سے حاصل کیا جا رہا ہے، آئندہ پچاس، ساٹھ برسوں میں اس ملک اور اس کی تہذیب کا کیا حال ہوگا؟ آج ہماری تہذیب اصل رنگ سے ہٹ چکی ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ علم وادب ایمان کی جڑوں کو گہرا اور مضبوط کرتا ہے:

''جب اسلام پھیل گیا اور جزیرۃالعرب سے دوسرے ممالک تک پہنچا تو ان ممالک کے عام لوگوں میں اسلام کو جلدی قبول کر لیا۔ لیکن جو لوگ علم وادب سے آگاہ تھے۔ انہوں نے اسلام کو جلدی قبول نہیں کیا۔ بلکہ ایک مدت گذر جانے کے بعد جب ان پر ثابت ہو گیا کہ اسلام دنیاوآخرت کا دین ہے تو پھر انہوں نے اسے قبول کیا''۔[8]

معصوم ادب کو یوں بیان کرتے ہیں کہ: '' ادب ایک لباس سے عبارت ہے جو تحریر اور تقریر کو پہناتے ہیں''۔[9] گویا ادب کے ذریعے تحریروں اور تقریروں کو پُرکشش بنایا جاسکتا ہے۔ اس بات کو تقویت گزرے ہوئے مصنفین کی تحریروں سے ملتی ہے۔ ممکن ہے کہ ادب علم نہ ہو۔ لیکن علم کا وجود ادب کے بغیر محال ہے۔ اس لئے معصوم فرماتے ہیں کہ: '' یتیم وہ نہیں جس کا باپ فوت ہو گیا ہو، یتیم وہ ہے جو علم وادب سے بے بہرہ ہو''۔[10] انسانی وقار کی سربلندی اور انسانوں میں اچھی صفات کے فروغ کے لئے بھی علم وادب لازمی جزو ہے، کیونکہ ایک ایسا معاشرہ جس کے افراد ادیب وعالم ہوں اس میں دوسروں کے حقوق کی پامالی کم دیکھنے میں آتی ہے اور اگر سب علم وادب سے آشنا ہو جائے تو تمام طبقوں کے باہمی تعلقات خوشگوار ہو جائیں۔

حاصل کلام

معاشرے کی سب سے بڑی خرابی اس وقت پید ہوتی ہے جب معاشرہ تعمیر و تخیل اور تخلیق کے معاملات سے دور ہو جاتا ہے۔ اس صورت حال کے ذمہ دار وہ ہوتے ہیں جو معاشرے میں موجود افراد کی ذہنی، فکری صلاحیتوں کو اجاگر کرنے کے بجائے ان پر شعور وادراک کے دروازے بند کر دیتے ہیں۔ ادب معاشرے کا اہم ستون ہے۔ آج سب سے اہم مسئلہ ادب کے معیار کا ہے۔ آج دنیا میں مقابلے کی دوڑ میں شامل ہونے کے لئے ہم نے اپنے اپنے معیارات قائم کر لئے ہیں۔ کہیں ہم ادب کی شائستگی کو معاشرے کی گلیوں میں تلاش کرتے ہیں تو شاعرانہ طبیعت کو استعمال کرتے ہوئے ہجر ووصال کی کیفیت بیان کرتے ہیں۔ اب ان میں سے کون سا معیار بہترین ہے یہ تو وقت اور حالات بہتر فیصلہ کر سکتے ہیں۔ کیا نثر میں ہمارا معیار اس بلندی پر ہے جہاں ہم سرسید، ابوالکلام، اشفاق احمد، مشتاق احمد یوسفی، غلام عباس جیسے بہت سے مصنفوں کی تحریروں کو مستند جانتے ہیں اور ان کے انداز بیان کو اپناتے ہیں۔ کیا ناول نگاری میں وہ معیار موجود ہے جو خدیجہ مستور، ہاجرہ مستور، قرۃالعین، بیگم خورشید اور انہی کے دور کے اور سے بہت سے ناول نگاروں کا آج کے دور میں ناول نگاروں سے موازنہ ہے؟

آج کا ناول نگار ایک افسانہ لکھتا ہے جس میں نہ معاشرے کی عکاسی ہوتی ہے اور نہ اپنی اقدار کی پاسداری کا ان کی تحریروں میں خیال ہے۔ اسی طرح شاعری میں میر درد، غالب، اقبال، فیض احمد فیض۔ اگر ان شخصیتوں کو پڑھ کر کوئی بھی شاعر یا نثر نگار مجموعی طور پر بہترین ادب کا خالق ہو سکتا ہے۔ ادب میں تعصب کی کوئی گنجائش نہیں۔ ادب چاہیے کسی بھی ملک کا ہو، کسی بھی شہر کا ہو، یعنی جس بھی رنگ و نسل سے تعلق رکھتا ہو، اس کی سب سے اہم ذمہ داری معاشرے کے مزاج کو سمجھنا اور اس کے مطابق تہذیبی، ادبی، ثقافتی روایتوں کو ہر عام وخاص کے ذہن میں تازہ کرنا ہے۔ آج اکیسویں صدی کے اس دور میں ہر گزرتے پل کے ساتھ ادب کو نئے تقاضوں کا سامنا ہے۔ جہاں امن وآشتی کی آزادی ہر انسان کے دل کی آواز ہے۔

*****

حوالہ جات

1۔ڈاکٹر انعام الحق، کوثر، *بلوچستان میں تحریک تصوف* (بلوچستان، سیرت اکادمی،1986ء) 117۔

2 ۔بیگم خورشید، عبدالحفیظ، *تہنیت* (کراچی، ندارد،1959ء)99۔

3۔ذوالفقار، زیدی، *اقوال معصومین* (کراچی، الحرمین پبلیشرز، 2002ء) 3۔

4۔بیگم خورشید، *تہنیت* : 100۔

5۔وحیدہ نسیم، *شبورانی*، ندارد (کراچی، ندارد، 1976ء) 10۔

6۔ ایضا: 30۔

7۔ایضا: 480۔

8۔ نقی، نقوی، *تاریخ اسلام* (کراچی، پریمہ پرنٹر، 1992ء) 10۔

9۔عبدالکریم، *سپرمین ان اسلام* :155۔

10۔ ایضا: 156۔

کتابیات

1) کوثر، ڈاکٹر انعام الحق، *بلوچستان میں تحریک تصوف*، بلوچستان، سیرت اکادمی،1986ء۔

2) عبدالحفیظ، بیگم خورشید، *تہنیت*، کراچی، ندارد،1959ء۔

3) زیدی، ذوالفقار، *اقوال معصومین*، کراچی، الحرمین پبلیشرز، 2002ء۔

4) نسیم، وحیدہ *شبورانی*، ندارد، کراچی، ندارد، 1976ء۔

5) نقوی، نقی، *تاریخ اسلام*، کراچی، پریمہ پرنٹر، 1992ء۔

6) عبدالکریم، *سپرمین ان اسلام*۔

انسانیت، معیشت اور ماحولیات

(کتاب "اسلام اور ماحولیات" کے آئینے میں)

HUMANITY, ECONOMICS & ENVIRONMENT

(*In the light of the book "Islam and the Environment)*

Dr. Sh. M. Hasnain

***Abstract*:**

The book "Islam & Environment", compiled by Allama Abdullah Jawadi Amoli, is infact the demonstration of Islamic teachings upon the subject of "Environment". But the book also presents precious ideas regarding Islamic Anthropolgy, and Divine Economics. Along with combination of scattered ideas about divine anthropology and economics through out the book, this article also reconstructs and highlights the relationship between humanity, economy and environment from Islam's point of view. The article also interprets the philosophical ideas in an easy way for an ordinary reader to understand. Although no new facts have been discovered in this article, but it is a research paper on the criteria of new interpretation of the discovered facts.

***Keywords*:** *Islam, Anthropology, Enviornment, Economics, Amoli.*

خلاصہ

علامہ عبد اللہ جوادی آملی نے اپنی تالیف "اسلام و محیط زیست"[1] میں اسلام کے نکتۂ نگاہ سے "ماحولیات" کے موضوع پر ایک عمیق فکری تحلیل پیش کی ہے۔ اگرچہ اس کتاب کا اصل موضوع "اسلام اور ماحولیات" ہے، تاہم اس میں پراکندہ طور پر اسلامی انسان شناسی اور الٰہی معیشت پر بھی گران قدر مطالب پیش کیے گئے ہیں۔ اس مقالہ میں کتاب کے صفحات پر بکھرے ہوئے ان مطالب کو یکجا کرنے کے علاوہ ان کی Reconstruction کے ذریعے "انسانیت، معیشت اور ماحولیات" کے عنوان سے ان مفاہیم کے درمیان اسلام کے نکتہ نگاہ سے پائے جانے والے ربط کو اجاگر کیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ ان مطالب کو ایک عام قاری کے لئے انتہائی آسان فہم بھی بنا دیا گیا ہے۔ اگرچہ اس مقالہ میں نئے حقائق دریافت نہیں کیے گئے لیکن دریافت شدہ حقائق کو کچھ اس طرح کنگھالا گیا ہے کہ مقالہ، ایک تحقیقی مقالہ قرار پائے۔

کلیدی کلمات: اسلام، ماحولیات، انسان شناسی، معیشت، اقتصادیات، آملی۔

اسلامی انسان شناسی

قرآن کریم کے مطابق انسان کائنات کی وہ تنہا حسین ترین مخلوق ہے جس کی تخلیق کے حسن کی داد خود خالق دیتا ہے :فَتَبٰرَكَ اللّٰهُ اَحْسَنُ الْخٰلِقِيْنَ(14:23) یعنی: "پس بابرکت ہے وہ اللہ جو سب سے بہتر خالق ہے۔" قرآن کی نظر میں انسان ایک انتہائی باکرامت مخلوق ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيْٓ اٰدَمَ وَحَمَلْنٰهُمْ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ وَرَزَقْنٰهُمْ مِّنَ الطَّيِّبٰتِ وَفَضَّلْنٰهُمْ عَلٰي كَثِيْرٍ مِّمَّنْ خَلَقْنَا تَفْضِيْلًا(70:17)یعنی: "اور بے شک ہم نے آدم کی اولاد کو کرامت بخشی اور انہیں خشکی اور تری میں سواری عطا کی اور ہم نے انہیں پاکیزہ چیزوں سے رزق عطا کیا اورانہیں اکثر مخلوقات پر، جنہیں ہم نے پیدا کیا ہے، فضیلت دے کر برتر بنا دیا۔" اللہ تعالی نے انسان کو یہ کرامت اور برتری بخشی ہے کہ وہ خلیفہ اللہ بن سکتا ہے : إِنِّي جَاعِلٌ فِي الْأَرْضِ خَلِيفَةً یعنی: "بے شک میں زمین میں خلیفہ بنارہا ہوں۔" لہٰذا انسان کی کرامت، اُس کی خلافت کی مرہونِ منت ہے او یہ خلافت انسان کے تمام علمی اور عملی امور میں اپنے خالق کے ارادہ کے تابع ہونے میں پوشیدہ ہے۔ کیونکہ اگر انسان اپنے علمی اور عملی کاموں میں خدا کے ارادہ کے تابع نہ رہے تو وہ خدا کا خلیفہ کہلانے کا مستحق نہیں ہے۔ قرآنی تعلیمات میں انسان کی شناخت یہی ہے۔ قرآن کریم کے مطابق انسان ذاتی طور پر حسن کا مالک ہونے کے ساتھ ساتھ عالمِ رنگ وبُو کے لئے زینت بخش ہے۔ انسان اس کائنات کا وہ عنوان ہے جس کے بغیر عالم ہستی کا کوئی عنوان معنی و مفہوم نہیں پاتا۔ بقول شاعر

الفاظ خلق ہم بن سب مہملات سے تھے　　　　معنی کی طرح ربط گفتار ہیں تو ہم ہیں۔

اس تناظر میں علامہ جوادی آملی کے مطابق، اسلامی Anthropology میں انسان ایک ایسی Triangle کی راس پر ہے جس کا Alpha اس کا خالق، Beta اس کا روح و بدن اور Gamma اس کی منزل یا غرض و غایت ہے۔اور سورہ مبارکہ "طٰہٰ" میں حضرت موسیٰ کلیم اللہ کی زبانی انسانی مثلث کے ان اضلاع کی طرف معجزہ آسا الفاظ میں اشارہ ہوا ہے: قَالَ رَبُّنَا الَّذِيْٓ اَعْطٰي كُلَّ شَيْءٍ خَلْقَهٗ ثُمَّ هَدٰى(50:20) یعنی: "(موسیٰ علیہ السلام نے) فرمایا: ہمارا رب وہی ہے جس نے ہر چیز کو (اس کے لائق) وجود بخشا پھر (اس کے حسبِ حال) اس کی رہنمائی کی۔" لہٰذا قرآنی انسان شناسی میں انسانی مثلث کا Alpha جسے علامہ جوادی عاملی انسان کے "فاعلی نظام" کا نام دیتے ہیں، دراصل، انسان کی تخلیق و تربیت کے ان اسباب پر مشتمل ہے جو یکتا و یگانہ خدا کے خلق فرمودہ ہیں۔ جہاں تک انسانی Beta کا تعلق ہے، جسے وہ انسان کے "داخلی نظام" کا نام دیتے ہیں، انسان کی مجرد روح اور مادی جسم کی ترکیب پر مشتمل ہے اور جہاں تک اس مثلث کے Gamma کا تعلق ہے، جسے وہ انسان کے "غائی نظام" کا نام دیتے ہیں،

در حقیقت، انسان کے ایک ابدی حیات سے ہمکنار ہونے کے ہدف اور غرض و غایت پر مشتمل ہے۔ جہاں تک اس مثلث کے پہلے دو اضلاع کا تعلق ہے، تو وہ احسن الخالقین کے تخلیق کردہ ہیں، لیکن انسانیت کے تیسرے ضلع کی ترسیم و تکمیل خود انسان پر چھوڑ دی گئی ہے۔

یہی وجہ ہے کہ انسان کوئے کمال کا سالک ہے اور اسے اپنے قدموں پر چل کر منزل مقصود تک پہنچنا ہے۔ انسانیت کی منزل مقصود خلیفۃ اللہ بننے اور مدینۂ فاضلہ (Utopia) بنانے میں ہے۔ یہی وہ نقطہ ہے جہاں انسان کا معیشت اور ماحولیات کے ساتھ رابطہ برقرار ہوتا ہے۔ دراصل، اسلامی تعلیمات میں انسان اور کائنات، دونوں نے اپنا وجود خدا سے پایا ہے اور یہ دونوں ایک دوسرے سے اس طرح جڑے ہوئے ہیں کہ مسلسل ایک دوسرے پر اثرانداز ہوتے ہیں۔ لہٰذا مضبوط معیشت اور سالم ماحولیات کے بغیر انسان کا نہ Beta استوار رہتا ہے، نہ Gamma۔ حقیقت تو یہ ہے کہ اسلام کے پیش کردہ مدینۂ فاضلہ کی تشکیل کے تین بنیادی عناصر بھی مہذب انسان، مضبوط معیشت اور پاکیزہ ماحولیات ہیں۔ مدینہ فاضلہ کے ان بنیادی عناصر کی طرف قرآن کریم میں واضح رہنمائی موجود ہے اور علامہ جوادی آملی کے مطابق: " رَبِّ اجْعَلْ هٰذَا بَلَدًا اٰمِنًا وَّارْزُقْ اَهْلَهٗ مِنَ الثَّمَرٰتِ...(126:2) یعنی: "اے میرے رب! اسے امن والا شہر بنا دے اور اس کے باشندوں کو طرح طرح کے پھلوں سے نواز!" جیسی آیات میں بیان ہونے والے وہ امور جن کی بازگشت آبادی، آزادی، امن اور سالم اقتصاد وغیرہ کی طرف ہے، یہ سب مدینۂ فاضلہ کے اوصاف و شرائط شمار ہوتے ہیں۔"[2]

نتیجہ یہ کہ اگر ہم انسان کی ماہیت کو اس مثلث پر تقسیم کر دیں جس کی اوپر ترسیم کی گئی ہے تو مضبوط معیشت اور سالم ماحولیات کے لئے انسان کی تگ و دَو اُس کی خلافت الٰہیہ کا لازمہ اور عینِ انسانیت ہے۔ کیونکہ اللہ تعالی نے انسان کو کائنات میں خلافت اور خلاقیت اسی لئے تو عطا کی ہے کہ وہ عالم طبیعت کے خام مواد سے اپنے لئے بہترین معیشت اور بہترین ماحول فراہم کرے۔

انسان اور معیشت

اوپر کہا جا چکا ہے کہ انسان کی کرامت، اُس کی الٰہی خلافت کی مرہونِ منت ہے او انسان کی الٰہی خلافت بذات خود، انسان کے تمام علمی اور عملی امور میں اپنے خالق کے ارادہ کے تابع ہونے میں پوشیدہ ہے۔ لہٰذا خدا کے ارادہ کے مطابق مضبوط معیشت کے لئے تگ و دَو انسان کا فرضِ منصبی ہے۔ علامہ عبد اللہ جوادی آملی کے مطابق: "انسانی زندگی کے لئے مناسب بستر مہیا کرنے کی غرض سے اللہ تعالیٰ نے خام مواد کو طبیعت کے دستر خوان کی غذا کے عنوان کے طور پر فراہم فرمایا اور انسان کو ہوش، استعداد، ٹیکنالوجی، اور خلاقیت عطا کی تاکہ وہ ایک مہمان کی حیثیت سے عالم طبیعت کے خام مواد کے دستر خوان پر بیٹھے اور اس سے بہترین طریقے سے بہرہ مند ہو۔"[3]

چنانچہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: هُوَ أَنشَأَكُم مِّنَ الْأَرْضِ وَاسْتَعْمَرَكُمْ فِيهَا وَاسْتَعْمَرَكُمْ فِيهَا(61:11) یعنی: " اللہ نے تمہیں مٹی سے خلق فرمایا ہے اور تم سے زمین کی آبادکاری چاہی ہے۔ " اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے انسان سے زمین کی آبادکاری کا مطالبہ کیا ہے۔ کیونکہ استفعال کا باب (استعمار) یہاں تحقیق کے لئے ہے؛ یعنی خداوند تعالیٰ نے تم سے اصرار کے ساتھ یہ مطالبہ کیا ہے کہ زمین کو آباد کرو تاکہ انسان کے لئے مناسب زندگی مہیا ہو۔قرآنی کی لغت میں استعمار کا مطلب زمین ، معادن، پہاڑوں، سمندروں ، صحراؤں، جنگلوں، ساحلوں وغیرہ کو آباد کرنے کی سنجیدہ جستجو اور مؤکد طلب کا نام ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ان تمام چیزوں کو "بکر" (Unused) خلق فرمایا ہے اور انسان کو انہیں آباد کرنے کی سوچ دی ہے اور ان کے منافع سے عادلانہ استفادے کا حکم دیا ہے اور اعلان فرمایا ہے کہ: "لِّلرِّجَالِ نَصِيبٌ مِّمَّا اكْتَسَبُواْ وَلِلنِّسَاءِ نَصِيبٌ مِّمَّا اكْتَسَبْنَ" (32:4) یعنی: "مردوں کے لئے اس میں سے حصہ ہے جو انہوں نے کمایا، اور عورتوں کے لئے اس میں سے حصہ ہے جو انہوں نے کمایا۔" اس کا مطلب یہ ہوا کہ انسان پر واجب بھی ہے کہ زمین کے اعماق سے لے کر آسمان کے سینہ تک، سب کو آباد کرے اور اس کے فوائد اور محصول اسی کے ہیں، نہ کسی غیر کے اور اس استفادے میں مرد اور عورت میں بھی کوئی فرق نہیں ہے۔

اسی طرح سورہ اعراف میں بھی زمینی وسائل سے استفادہ انسان کا حق بھی شمار کیا گیا ہے اور اس کا الٰہی فریضہ بھی ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے: وَلَقَدْ مَكَّنَّاكُمْ فِي الْأَرْضِ وَجَعَلْنَا لَكُمْ فِيهَا مَعَايِشَ(10:7) یعنی: "اور بے شک ہم نے تم کو زمین میں تمکّن و تصرّف عطا کیا اور ہم نے اس میں تمہارے لئے اسبابِ معیشت پیدا کئے۔" اس آیت سے جو بات سمجھی جا سکتی ہے وہ یہ ہے کہ لوگوں پر واجب ہے کہ وہ اقتصاد میں کسی کے غلام نہ ہوں اور اگر انہوں نے اس حوالے سے کوتاہی کی تو ان سے پوچھا جائے گا اور قیامت کے دن انہیں اس کی سزا ملے گی۔ یہ ایک ہی معاملہ کے دو رخ ہیں؛ یعنی دین ایک طرف دینی معاشرہ کے اقتصادی استقلال کا خوہاں اور اسے انسان کا حق قرار دیتا ہے اور دوسری طرف اسے ایک الٰہی فریضہ بھی قرار دیتا ہے۔ خلاصہ یہ کہ دینی تعلیمات کی روشنی میں مضبوط معیشت انسان کا حق اور فرض ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام طبیعی وسائل سے استفادہ پر تاکید کرتا ہے۔ قرآن انسان کو کبھی وَابْتَغُوْا مِنْ فَضْلِ اللهِ(10:62) (یعنی: "اور (پھر) اللہ کا فضل (یعنی رزق) تلاش کرنے لگو!") کے بیان کے ذریعے اور کبھی فَامْشُوْا فِيْ مَنَاكِبِهَا(15:67) (یعنی: زمین کے دوش پر چلو اور روزی تلاش کرو)" کی عبارت کے ذریعے عالم طبیعت کے وسائل سے استفادے کا حکم دیتا ہے۔ اس فرمان کا لازمہ معادن نکالنے کے لئے محنت کرنا، کھیتی باڑی، صنعت و تجارت اور عالم طبیعت کے خام مواد سے جس قدر ہو سکے استفادہ کرنا ہے۔

علامہ جوادی آملی کے مطابق: " قرآن کریم نے انسان کو زمین کی آبادکاری کا حکم دیا ہے اور اس سے اصرار کے ساتھ یہ مطالبہ کیا ہے کہ وہ زمین کی آبادکاری میں جان لڑائے۔ انسان کا فریضہ یہ ہے کہ اپنی طاقت کو بروئے کار لائے۔ لہٰذا جن لوگوں میں کھیتی باڑی، مویشی پروری، صنعت، پیشہ وری اور دوسرے مفید مشغلوں کی توانائی پائی جاتی ہو اور اس کے باوجود وہ محنت نہ کریں، خواہ اس لئے کہ ان کے پاس مالی ثروت موجود ہو اور اپنے آپ کو کام کرنے سے بے نیاز پاتے ہوں، خواہ تن پروری کی وجہ سے ایسا کرنے سے کتراتے ہیں، انہوں نے نہ تنہا قرآن کریم کے حکم پر عمل نہیں کیا، تمام انبیائے الٰہی کے فرامین کو ٹھکرایا ہے۔"[4]

دراصل، اس عبارت کے مصنف کے مطابق الٰہی اقتصادیات Divine Economics کے بنیادی اصول تمام آسمانی ادیان میں مشترک ہیں۔ ان کے مطابق تمام انبیاء علیہم السلام اللہ تعالٰی کے برگزیدہ اور ایک ہی غیبی خزانے سے خلق ہوئے ہیں اور ان سب کے فرامین آپس میں ہماہنگ اور ایک جیسے ہیں۔ ہر نبی لوگوں کو مبداء، معاد، وحی، فرشتے، زندگی کے سیدھے راستے وغیرہ کی دعوت دیتا ہے۔ اگر کوئی ایک پیغمبر کی نبوت کو جھٹلائے اور اس کا انکار کرے تو گویا اس نے تمام انبیاء کی نبوت کو ٹھکرایا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم نے مؤمنین کو حکم دیا ہے کہ وہ یہ نعرہ لگائیں کہ: لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْهُمْ (136:2) یعنی: "ہم رسالت کی حقیقت اور رسولوں کو قبول کرنے میں کسی فرق کے قائل نہیں ہیں۔" پس شریعتوں کے اختلاف کے باوجود تمام انبیائے الٰہی کی دعوت وارشاد کے بنیادی اصول یکساں ہیں۔ لہٰذا جب حضرت صالح علیہ السلام فرماتے ہیں: "اللہ تعالٰی نے تمہیں زمین سے خلق فرمایا ہے اور اس کا حکم ہے کہ زمین کو آباد کرو"، تو ہر وہ شخص جو اللہ تعالٰی اور انبیاء پر ایمان رکھتا ہے، اسے حضرت صالح علیہ السلام کے اِس حکم کی اطاعت کرنی چاہیے اور اس لحاظ سے سب کا یہ فریضہ ہے کہ زمین کو آباد کریں؛ خواہ ظاہری آبادکاری، خواہ باطنی آبادکاری اور ایسا بستر فراہم کرنا جس سے معاشرہ کی اصلاح ہو سکے۔

زمین کی آبادکاری اور معیشت کی فراہمی کے حوالے سے حضرت علی علیہ السلام کا فرمان ہے: " من وجد ماء و ترابا ثم افتقر فابعده الله"[5] یعنی: "جس شخص کے پاس پانی اور زمین ہو اور اس کے باوجود وہ فقر میں مبتلا ہو تو وہ رحمت الٰہی سے دور ہے۔" لہٰذا جس ملت کے پاس پانی اور کھیتی باڑی کے لئے وافر مقدار میں زمین موجود ہو لیکن وہ پانی کا صحیح استعمال اور زمین کی اصلاح نہ کر سکے، ان سے استفادہ نہ کرے اور نکمّے پن یا غلط کاری کی وجہ سے محتاج ہو جائے تو ایسی قوم اللہ کی رحمت سے دور ہے۔ اللہ تعالٰی نے انسان کے لئے تمام موجودات عالم کو مسخر کر دیا ہے۔ سورہ ابراہیم میں ارشاد فرماتا ہے: اَللّٰهُ الَّذِىْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَاَنْزَلَ مِنَ السَّمَاۤءِ مَاۤءً فَاَخْرَجَ بِهٖ مِنَ الثَّمَرٰتِ رِزْقًا لَّكُمْ ۚ وَسَخَّرَ لَكُمُ الْفُلْكَ لِتَجْرِىَ فِى الْبَحْرِ بِاَمْرِهٖ ۚ وَسَخَّرَ لَكُمُ الْاَنْهٰرَ ۚ وَسَخَّرَ لَكُمُ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ دَاۤىِٕبَيْنِ

وَسَخَّرَ لَكُمُ الَّيْلَ وَالنَّهَارَ (14:32،33) یعنی: "اللہ وہ ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا فرمایا اور آسمان کی جانب سے پانی اتارا پھر اس پانی کے ذریعہ سے تمہارے رزق کے طور پر پھل پیدا کئے، اور اس نے تمہارے لئے کشتیوں کو مسخر کر دیا تاکہ اس کے حکم سے سمندر میں چلتی رہیں اور اس نے تمہارے لئے دریاؤں کو (بھی) مسخر کر دیا۔ اور اس نے تمہارے فائدہ کے لئے سورج اور چاند کو مسخر کر دیا جو ہمیشہ گردش کرتے رہتے ہیں اور تمہارے لئے رات اور دن کو بھی مسخر کر دیا۔" ان آیات میں "سَخَّرَ" کا کلمہ چار بار مکرر آیا ہے اور "لَکُمْ" کی ضمیر خطاب بھی کئی بار دہرائی گئی ہے جس سے تمام موجودات عالم کا انسان کے لئے مسخر ہونا روز روشن کی طرح برملا ہو جاتا ہے۔

اللہ تعالی نے سب موجودات کو خدا نے حکم دیا ہے کہ وہ راہ خدا کے سالک انسان کی پیروی کریں اور اُس کے سامنے تسخیر ہو جائیں۔ لہٰذا انسان اور طبیعت کا رابطہ تسخیری رابطہ ہے اور انسان کے طبیعت کی تسخیر کے طفیل اپنی معیشت کا اہتمام کرنا ہے۔ لہٰذا ضروری ہے کہ ان نعمتوں سے مثبت اور احسن طریقے سے استفادہ کیا جائے۔ اگر انسان بھی سمندر سے عام استفادہ کرے تو وہ اس میں اور آبی مخلوقات اور دریائی پرندوں میں کوئی فرق نہ رہے گا اور سمندر کی انسان کے لئے تسخیر بے معنی ہو کر رہ جائے گی۔ اگر انسان سمندر کے پانی اور اس میں کشتیرانی سے بڑھ کر الٰہی نعمتوں کے سمندر میں غوطہ ور ہو کر سمندر کے اعماق میں، اُس کی اندرونی اور بیرونی فضا میں علمی تحقیقات انجام دے اور سمندری معادن اور اس کے دل میں موجود سرمائے کو پہچانے اور انسانیت کی خدمت میں پیش کرے تو اس وقت یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس نے تسخیر شدہ سمندر سے صحیح فائدہ اٹھایا ہے۔ جیسا کہ اگر انسان فقط سورج کی گرمی اور روشنی سے استفادہ کرے تو انسان اور دیگر زندہ موجودات؛ خواہ حیوانات، خواہ نباتات، میں کوئی فرق نہ ہو گا۔ صرف وہ شخص یہ دعوی کر سکتا ہے کہ اس نے سورج کی نعمت سے بھرپور فائدہ اٹھایا اور آیہ کریمہ "سَخَّرَ لَكُمُ الشَّمْسَ" پر عمل کیا ہے جو سورج سے اٹھائے جانے والے مختلف فائدوں اور اس کے اقتصادی منافع کو جانتا ہو اور انہیں عالمِ بشریت کے سپرد کر سکے۔

زمین کو بھی خدا نے انسان کے لئے مسخر کیا ہے تاکہ اس پر آسانی سے زندگی گزار سکے؛ کھیتی باڑی کے لئے اس میں ہل چلا سکے اور معادن نکالنے کے لئے زمین شناسی اور معدن شناسی کے مختلف شعبوں میں تحقیقات کے لئے زمین کے اعماق میں کھدائی کر سکے اور زمین میں موجود Faults، نیز زلزلہ خیز علاقوں کی تشخیص کے لئے گہری تحقیقات انجام دے سکے تاکہ لوگ رفاہ اور امن کی زندگی سے مستفید ہوں۔ لیکن اگر انسان زمین سے بس اتنا استفادہ کرے کہ اس پر آشیانہ بنائے اور معمول کی زندگی گزارے تو زمین سے یہ فائدہ تو حیوانات بھی اٹھاتے ہیں۔ جیسا کہ انسان زمین کے اعماق میں جا کر تیل، گیس اور دیگر زمینی وسائل نکالتا ہے، اسے چاہیے کہ فضا اور اس کے

موجودات سے بھی بھرپور فائدہ اٹھائے۔اسلام میں معیشت کی فراہمی کی اہمیت کے حوالے سے امام باقرعلیہ السلام کافرمان ہے کہ : " من طلب الدنیا استعفافا عن الناس و سعیا علی اھلہ و تعطفا علی جارہ لقی اللہ(عزو جل) یوم القیامۃ و وجھہ مثل القمر لیلۃ البدر"[6] یعنی : " جو شخص لوگوں سے بے نیازی، اپنے اہل و عیال کی ضروریات پوری کرنے اور اپنے ہمسایہ پر انفاق کی غرض سے دنیا بنانے کے لئے محنت کرتا ہے، وہ قیامت کے دن اس حال میں اللہ تعالیٰ سے ملاقات کاشرف پائے گا کہ اس کا چہرہ چودہویں رات کے چاند کی مانند چمک رہا ہوگا۔"
ان احادیث سے پتہ چلتا ہے کہ شریعت کی پیروی، معیشتی امور میں فعالیت کو بھی اتنا مقدس بنادیتی ہے جتنا کہ خدا کی راہ میں جہاد مقدس ہے۔ لہٰذا دین مقدس اسلام کے مطابق مقدس امور فقط دعا و عبادات میں محدود نہیں، بلکہ ان کا دائرہ کار اس سے وسیع تر ہے اور ثروت کی عادلانہ تقسیم اور قوم و ملک کے لئے اقتصادی وسائل کی فراہمی جیسے اقتصادی امور بھی جب اللہ تعالیٰ کے قرب اور اس کی رضا کے حصول کی غرض سے انجام دیے جائیں تو اس دینی اور قدسی شمار ہوتے ہیں اور ان کی انجام دہی ایک مومن انسان کے لئے اُس کی خلافت الٰہیہ کا تقاضا ہے۔

معیشت کی ترقی پر تاکید

علامہ عبداللہ جوادی آملی کے مطابق قرآن کریم نے زراعت و صنعت کی ترقی پر خاص توجہ دی ہے۔انبیائے الہی کی اس حوالے سے سعی وتلاش اور سیرت کا نچوڑ یہ ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام جیسے انبیاء نے صنعتی وسائل سے استفادہ کی روش اپنائی۔ ، قرآن کریم اس روش کو یوں بیان کرتا ہے : ۔۔۔ وَاَسَلْنَا لَهٗ عَيْنَ الْقِطْرِ(34:12) یعنی : "ہم نے ان کے لئے پگھلی چاندی کا چشمہ جاری کردیا" ؛يَعْمَلُوْنَ لَهٗ مَا يَشَاۗءُ مِنْ مَّحَارِيْبَ وَتَمَاثِيْلَ وَجِفَانٍ كَالْجَوَابِ وَقُدُوْرٍ رّٰسِيٰتٍ اِعْمَلُوْٓا اٰلَ دَاوٗدَ شُكْرًا وَقَلِيْلٌ مِّنْ عِبَادِيَ الشَّكُوْرُ(34:13) یعنی : " وہ (جنّات) ان کے لئے جو وہ چاہتے تھے بنادیتے تھے۔ اُن میں بلند و بالا قلعے اور مجسّمے اور بڑے بڑے تھال تھے جو تالاب اور لنگر انداز دیگوں کی مانند تھے۔اے آلِ داوٗد! (اللہ کا) شکر بجالاتے رہو، اور میرے بندوں میں شکر گزار کم ہی ہوئے ہیں۔" ان آیات اور تاریخی واقعات سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کے عہد حکومت میں معماری کی صنعت کو عروج حاصل تھا۔ عالیشان عمارتیں اور اعلیٰ وارفع قصر بنائے گئے۔اسی طرح نقاشی اور ہنر کی صنعت میں فرشتوں، پیغمبروں اور صالحین کے مجسمے انتہائی خوبصورتی سے بناتے تھے۔بڑے بڑے برتن اور دیگیں بنائی گئیں۔ سباء کی ملکہ کا حضرت سلیمان (ع) کے صحن میں داخل ہونے کا قصہ اور ان کا وہ شیشے کا ظریف تخت دیکھنا اور یہ تصور کرنا کہ وہاں پانی ہے اور پنڈلیوں سے لباس اتارنا، یہ سب کچھ اس دَور کی معماری کی صنعت، ہنر اور صنعت کی پیشرفت کی دلیل ہے: فَلَمَّا رَاَتْهُ حَسِبَتْهُ لُجَّةً وَّكَشَفَتْ عَنْ سَاقَيْهَا قَالَ اِنَّهٗ صَرْحٌ مُّمَرَّدٌ مِّنْ

قَوَارِيْرَ---(44:27) یعنی: "جب ملکہ نے اس فرش کو دیکھا تو اسے گہرے پانی کا تالاب سمجھا اور اس نے (پائینچے اٹھا کر) اپنی دونوں پنڈلیاں عریاں کر دیں۔"

اسی طرح حضرت سلیمان علیہ السلام کے والد، حضرت داؤد علیہ السلام کو یہ ذمہ داری ملی کہ وہ اس الٰہی غیبی نعمت سے کہ ان کے ہاتھ میں سخت ٹھنڈا لوہا موم کی طرح نرم ہو جاتا تھا، زرہ بافی کی صنعت کو فروغ دیں اور زرہ کے حلقوں اور مہروں کے درمیان باہمی نظم کا خیال رکھیں۔ اس حوالے سے قرآن کریم کا بیان یہ ہے: وَلَقَدْ اٰتَيْنَا دَاوٗدَ مِنَّا فَضْلًا يٰجِبَالُ اَوِّبِيْ مَعَهٗ وَالطَّيْرَ وَاَلَنَّا لَهُ الْحَدِيْدَ اَنِ اعْمَلْ سٰبِغٰتٍ وَّقَدِّرْ فِي السَّرْدِ وَاعْمَلُوْا صَالِحًا---(10،11:34) یعنی: "اور بے شک ہم نے داؤد (علیہ السلام) کو اپنی بارگاہ سے بڑا فضل عطا فرمایا، (اور حکم فرمایا:) اے پہاڑو! تم اِن کے ساتھ مل کر خوش الحانی سے (تسبیح) پڑھا کرو، اور پرندوں کو بھی یہی حکم دیا اور ہم نے اُن کے لئے لوہا نرم کر دیا (اور ارشاد فرمایا) کہ کشادہ زرہیں بناؤ اور (ان کے) حلقے جوڑنے میں اندازے کو ملحوظ رکھو اور (اے آلِ داوؤد!) تم لوگ نیک عمل کرتے رہو۔" اسی طرح ایک اور آیت میں ارشاد ہوا ہے: وَعَلَّمْنٰهُ صَنْعَةَ لَبُوْسٍ لَّكُمْ لِتُحْصِنَكُمْ مِّنْۢ بَاْسِكُمْ فَهَلْ اَنْتُمْ شٰكِرُوْنَ(80:21) یعنی: "اور ہم نے داؤد (علیہ السلام) کو تمہارے لئے زِرہ بنانے کا فن سکھایا تھا تاکہ وہ تمہاری لڑائی میں تمہیں ضرر سے بچائے، تو کیا تم شکر گزار ہو؟"

شیخ الانبیاء حضرت نوح علیہ السلام کا شمار صنعت کے علم سے درست استفادہ کرنے میں سابقین میں سے ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں کشتی سازی کی تعلیم کے ساتھ ساتھ عملی طور پر بھی توفیق دی اور ان کی تائید فرمائی۔ اس حوالے سے قرآن کریم کا فرمان ہے: فَاَوْحَيْنَآ اِلَيْهِ اَنِ اصْنَعِ الْفُلْكَ بِاَعْيُنِنَا وَوَحْيِنَا(27:23) یعنی: "پھر ہم نے ان کی طرف وحی بھیجی کہ تم ہماری نگرانی میں اور ہمارے حکم کے مطابق ایک کشتی بناؤ۔" نیز جناب ذوالقرنین کی اس زمانے میں میسر وسائل سے بھرپور استفادے کی پسندیدہ روش کے بارے میں قرآن نے بتایا ہے کہ آپ تمام ضروری امکانات سے بہرہ مند تھے۔ انہوں نے قابل توجہ کام انجام دیے جن میں سے ایک نا قابل نفوذ بند کی تعمیر تھی جو اونچائی اور صیقل ہونے کی وجہ سے قابل فتح نہ تھا اور مضبوط بھی اس قدر تھا کہ اس میں نقب زنی یا سوراخ کرنے کا کوئی امکان نہ تھا۔ کیونکہ یہ اہم بند، مٹی، اینٹ، پتھر، سیمنٹ اور ان جیسی چیزوں سے نہیں، بلکہ عظیم آہنی بند تھا جو لوہے اور سکے کے پگھلائے گئے ٹکڑوں سے بنایا گیا تھا: اٰتُوْنِيْ زُبَرَ الْحَدِيْدِ حَتّٰٓى اِذَا سَاوٰى بَيْنَ الصَّدَفَيْنِ قَالَ انْفُخُوْا حَتّٰٓى اِذَا جَعَلَهٗ نَارًا قَالَ اٰتُوْنِيْٓ اُفْرِغْ عَلَيْهِ قِطْرًا(96:18) یعنی: "تم مجھے لوہے کے بڑے بڑے ٹکڑے لا دو، یہاں تک کہ جب اس نے (وہ لوہے کی دیوار پہاڑوں کی) دونوں چوٹیوں کے درمیان برابر کر دی تو کہنے لگا: (اب

آگ لگا کر اسے) دھونکو، یہاں تک کہ جب اس نے اس (لوہے) کو (دھونک دھونک کر) آگ بنا ڈالا تو کہنے لگا: میرے پاس لاؤ (اب) میں اس پر پگھلا ہوا تانبا ڈالوں گا۔"

ان آیات کی روشنی میں مجموعی طور پر ایک دینی حکومت کی الٰہی اقتصادیات کی جہت کا پتہ چلتا ہے اور اس سے معیشت و اقتصادیات کے وہ کلی قوانین سامنے آتے ہیں جو ایک طرف معیشت کی ترقی کی ضمانت فراہم کرتے اور دوسری طرف معیشت کی ترقی کی راہ میں حائل رکاوٹیں دور کرتے ہیں۔ اسلام کے معیشت کی ترقی کے حوالے سے تشویقی احکام کا خلاصہ یہ ہے کہ اسلامی معاشرہ میں صنعت کی پیشرفت، ایک پسندیدہ اور مورد ترغیب امر ہے۔ علامہ جوادی آملی کے بقول: "حضرت نوح علیہ السلام کی کشتی سازی کی صنعت، ہر قسم کے سمندری، زیر سمندری نقلی وسائل کے لئے ایک بہترین نمونہ ہے۔ نیز یہ زمینی اور ہوائی ذرائع حمل و نقل کے لئے بھی ایک عام نمونہ ہے۔ اسی طرح حضرت داؤد علیہ السلام کی زرہ بافی کی صنعت ہر قسم کے دفاعی وسائل کی ساخت کے لئے ایک ماڈل ہے۔ حضرت سلیمان علیہ السلام کی معماری، Handicraft اور ظریف ہنری کام اور دھات کے برتن بنانے کی صنعت ایسی صنعتوں کے لئے ایک نمونہ اور ماڈل ہے جن سے انسانوں کی فردی اور اجتماعی، نیز ہنری اور ادبی ضروریات برطرف ہوتی ہوں۔"[7] خلاصہ یہ کہ انبیائے الٰہی کی سیرت و کردار کی روشنی میں ایک دینی معاشرے میں صنعت کی ترقی پر خاص توجہ ضروری اور ہر زمانے میں اس زمانے کے لوگوں کی علمی اور عملی ضروریات پوری کرنے کے لئے صنعت سے صحیح سمت میں بھرپور استفادہ لازمی ہے۔

جہاں تک اسلام کی ان تعلیمات کا تعلق ہے جو معیشت کی ترقی میں حائل رکاوٹیں دور کرتی ہیں، ان میں امانت کی پاسداری، اموال کی گردش، طبقاتی تقسیم اور سرمایہ داری کی ممانعت کو معیشت و اقتصادیات کے کلی قوانین شمار کیا جا سکتا ہے۔ امانت کے حوالے سے ارشاد باری تعالیٰ ہے: اِنَّ اللّٰہَ یَاۡمُرُکُمۡ اَنۡ تُؤَدُّوا الۡاَمٰنٰتِ اِلٰۤی اَہۡلِہَا(58:4) یعنی: "بے شک اللہ تمہیں حکم دیتا ہے کہ امانتیں انہی لوگوں کے سپرد کرو جو ان کے اہل ہیں۔" یقینا ایک دوسرے کی امانتوں کے احترام کی معیشت پر تاثیر ایک اقتصادان کے لئے بہت واضح ہے۔ اسلام میں کسی شخص یا گروہ کو یہ حق حاصل نہیں ہے کہ وہ امانت میں خیانت کرے۔ اسی طرح اسلامی تعلیمات کی رو سے ایک معاشرہ میں موجود تمام اموال، تمام انسانوں کے امور کی اصلاح کے لئے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام شخصی ملکیت کا قائل ہونے کے باوجود یہ اجازت نہیں دیتا کہ شخصی مالکیت کا قانون، معاشرے کی محرومیّت کا سبب بنے۔ اسلام مسلم امت کو زراندوزی کی اجازت نہیں دیتا اور نہ ہی لوگوں کے شخصی اموال پاگل، بے عقل اور دیوانوں کے سپرد کرنے کی اجازت دیتا ہے۔ قرآن کریم کا بیان یہ ہے: وَلَا تُؤۡتُوا السُّفَہَآءَ اَمۡوَالَکُمُ الَّتِیۡ جَعَلَ اللّٰہُ لَکُمۡ

قِیٰمًا... (5:4) یعنی: "اور تم بے سمجھوں کو اپنے (یا ان کے) مال سپرد نہ کرو جنہیں اللہ نے تمہاری معیشت کی استواری کا سبب بنایا ہے۔"

اسی طرح اسلام مال اندوزی سے روکتا ہے اور اسلام کی نظر میں ان کاموں کی حیثیت ایسی ہے جیسے کسی رگ میں دوڑتا خون کسی جگہ رک جائے، کہ جس سے تمام اعضاء فالج زدہ ہو جائیں گے۔ لہٰذا اسلام معاشرے کے تمام طبقات کے لئے سرمائے کے بہاؤ کو لازم قرار دیتا ہے۔ ارشاد باری تعالی ہے: وَالَّذِیۡنَ یَکۡنِزُوۡنَ الذَّهَبَ وَالۡفِضَّةَ وَلَا یُنۡفِقُوۡنَهَا فِیۡ سَبِیۡلِ اللّٰهِ فَبَشِّرۡهُمۡ بِعَذَابٍ اَلِیۡمٍ (34:9) یعنی: "اور وہ لوگ جو سونا اور چاندی ذخیرہ کرتے ہیں اور اسے اللہ کی راہ میں خرچ نہیں کرتے تو انہیں دردناک عذاب کی خبر سنادیں۔" یہ آیت اور اس جیسی آیات مال کے رکود سے ممانعت اور اس کے معاشرے کے سب اعضاء کے اندر بہاؤ کے لازمی ہونے کی دلیل ہیں۔ لہٰذا اسلام یہ اجازت نہیں دیتا کہ ایک ملک کی ثروت ایک خاص طبقہ کے ہاتھوں میں گردش کرتی رہے اور دوسروں کے ہاتھوں میں بالکل نہ پہنچے؛ بلکہ اسلام یہ فتویٰ دیتا ہے کہ ثروت کی گردش مکمل ہونی چاہیے تاکہ یہ سب لوگوں کے ہاتھوں میں پہنچے اور: " (سارا مال صرف) تمہارے مال داروں کے درمیان ہی نہ گردش کرتا رہے۔": کَیۡ لَا یَکُوۡنَ دُوۡلَةًۢ بَیۡنَ الۡاَغۡنِیَآءِ مِنۡکُمۡ (7:59) جیسی آیات اس مطلب کی دلیل ہیں۔ لہٰذا اسلامی تعلیمات کی روشنی میں کسی بھی صورت میں مال کو مخصوص اشخاص یا مخصوص عہدوں کے ہاتھوں میں محصور نہیں ہونا چاہیے بلکہ اسے معاشرے کے تمام طبقات میں گردش کرنی چاہیے۔

علامہ جوادی آملی کے بقول: "اسلام کی یہ سوغات، سالم اقتصادیات کی عالی اساس ہے جس کی بنیاد پر سرمایہ داری کے "فضلے" اور حکومت سالاری اور مارکسیزم کے "خون" کے درمیان سے دینی اقتصاد کی خالص "دودھ" کو جدا کیا جاسکتا ہے تاکہ پہلے کی افراط اور دوسرے کی تفریط سے نجات پاتے ہوئے اسلامی عدالت کے مرکزی ستون تک رسائی حاصل ہو سکے۔"[8] اسلام رضایت کی تجارت جیسے جائز طریقوں سے سرمائے کی مکمل گردش اور لوگوں کے ہاتھوں میں مال کی گردش کو پسند کرتا ہے۔ اسلام وراثت اور بخشش وغیرہ کے علاوہ مال کے انتقال اور گردش کا اصلی ذریعہ، رضایت کی تجارت کو قرار دیتا ہے۔ اسلام کی رو سے رضایت کے بغیر تجارت یا جوئے جیسے امور میں تجارت کے بغیر رضایت، دونوں ممنوع ہیں۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے: " یٰۤاَیُّهَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا لَا تَاۡکُلُوۡۤا اَمۡوَالَکُمۡ بَیۡنَکُمۡ بِالۡبَاطِلِ اِلَّاۤ اَنۡ تَکُوۡنَ تِجَارَةً عَنۡ تَرَاضٍ مِّنۡکُمۡ (29:5) "یعنی: "اے ایمان والو! تم ایک دوسرے کا مال آپس میں ناحق طریقے سے نہ کھاؤ سوائے اس کے کہ تمہاری باہمی رضامندی سے کوئی تجارت ہو۔"

نیک کرداری اور معیشت

علامہ جوادی آملی کے مطابق اس مطلب پر توجہ ضروری ہے کہ دین حقوق اور فرائض دونوں بیان کرتا ہے۔ خدا نے انسان کو جہاں حق حاصل خیز زمین، سالم فضا، فراوان اور صاف پانی اور ایسے دسیوں طبیعی وسائل کا مالک بنا کر اسے ان میں تصرف کا حق دیا ہے، وہاں انسان کے فرائض بھی رکھے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کو یہ فریضہ بھی سونپا ہے کہ وہ ان وسائل سے استفادہ کرنے میں خود انہیں نابود نہ کر دے۔ یہی وجہ ہے کہ اس نے زمین میں فساد پھیلانے والوں کو تلخ انجام کی وعید سنائی ہے۔ لہٰذا اسلامی تعلیمات کی روشنی میں انسان کی معیشت کا اس کے کردار کے ساتھ گہرا ربط ہے۔ اس مدعی پر یہ آیت دلیل ہے جس میں ارشاد باری تعالیٰ ہے: وَّاَنْ لَّوِ اسْتَقَامُوْا عَلَى الطَّرِيْقَةِ لَاَسْقَيْنٰهُمْ مَّاۗءً غَدَقًا(16:72) یعنی: "اور یہ کہ اگر وہ ((ذکرِ الٰہی کے) راستے پر قائم رہتے تو ہم انہیں وافر پانی کے ساتھ سیراب کرتے۔" اس آیت کی بنیاد پر، راہ راست پر استواری، وافر پانی سے بہرہ مندی کا سبب ہے جو خشک کھیتوں، چراگاہوں، جنگلوں، حیوانوں اور انسانوں کو سیراب کرتا ہے۔ پس اللہ تعالیٰ لوگوں کے نیک کاموں کی وجہ سے انہیں اپنی برکتوں اور مادی نعمتوں سے نوازتا ہے۔ ایک اور آیت میں انسانی عمل اور معیشت کے رابطہ کے حوالے سے ارشاد باری تعالی ہے : وَلَوْ اَنَّهُمْ اَقَامُوا التَّوْرٰىةَ وَالْاِنْجِيْلَ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِمْ مِّنْ رَّبِّهِمْ لَاَكَلُوْا مِنْ فَوْقِهِمْ وَمِنْ تَحْتِ اَرْجُلِهِمْ(66:5) یعنی: "اور اگر وہ لوگ تورات اور انجیل اور جو کچھ ان کی طرف ان کے رب کی جانب سے نازل کیا گیا تھا قائم کر دیتے تو (انہیں مالی وسائل کی اس قدر وسعت عطا ہو جاتی کہ) وہ اپنے اوپر سے (بھی) اور اپنے پاؤں کے نیچے سے (بھی) کھاتے۔" جس طرح ایمان، تقوا اور گناہوں کی بخشش کا بہشت میں داخل ہونے کے ساتھ رابطہ ہے، اسی طرح تورات، انجیل اور قرآن کے احکام پر عمل کا بھی آسمانی و زمینی نعمتوں سے مستفید ہونے سے رابطہ ہے۔ " مِنْ فَوْقِهِمْ " سے مراد وہ آسمانی نعمتیں ہیں جو بارش، برفباری یا سورج کی روشنی کی صورت میں ظاہر ہوتی ہیں اور " وَمِنْ تَحْتِ اَرْجُلِهِمْ " سے مراد زمینی نعمتیں، زمین کا زرخیز ہونا اور زمین کے دل سے چشموں اور ندی نالوں کا جاری ہونا ہے۔

سورہ اعراف میں بھی انسانی عمل اور معیشت کے رابطہ ان الفاظ میں جوڑا گیا ہے: وَلَوْ اَنَّ اَهْلَ الْقُرٰٓى اٰمَنُوْا وَاتَّقَوْا لَفَتَحْنَا عَلَيْهِمْ بَرَكٰتٍ مِّنَ السَّمَاۗءِ وَالْاَرْضِ(96:7) یعنی: "اور اگر (ان) بستیوں کے باشندے ایمان لے آتے اور تقوی اختیار کرتے تو ہم ان پر آسمان اور زمین سے برکتیں کھول دیتے۔" اس آیت کی اساس پر شہروں اور دیہاتوں کے بسنے والوں کا تقوی اور ایمان آسمانی اور زمینی برکتوں کے دروازوں کے کھلنے کا موجب بنتا ہے۔ یہ آیت انسان کے اعمال اور کائنات کے حوادث کے درمیان رابطہ ثابت کرتی ہے۔ اور اس میں جن آسمانی برکتوں کی بات کی گئی

ہے ان کا دائرہ بہت وسیع ہے۔ کیونکہ بعض مفسرین کے مطابق " بَرَكٰتٍ مِّنَ السَّمَاءِ وَالْاَرْضِ " سے مراد فقط برفباری، بارش اور سورج، چاند کی روشنی جیسی آسمانی برکتیں اور فصلوں، پانی کے سرچشموں اور پھلوں، پھولوں جیسی زمینی برکتیں ہی نہیں، بلکہ آسمانی برکتوں سے کشفی اور شہودی علوم اور زمینی برکتوں سے تمام حصولی علوم بھی مراد ہیں۔[9]

قرآن اس نکتہ سے پردہ ہٹاتا ہے کہ انسان اگر حدود الٰہی کے اندر رہتے ہوئے معیشت کی تلاش کرے تو زمین و آسمان، بادل، ہوا، چاند، سورج اور عالم طبیعت کی تمام طاقتیں انسان کے کام آتی ہیں اور اسے سامان معیشت فراہم کرتی ہیں۔ لیکن اگر انسان اپنے خدا کے خلاف قد علم کرے تو نظام ہستی کے تمام مظاہر اس سے ٹکراتے اور ردّ عمل دکھاتے ہیں۔ بنابریں، کائنات کے حوادث ایک حد تک لوگوں کے اپنے اعمال کے تابع ہیں؛ یعنی اگر لوگ اللہ تعالیٰ کی اطاعت کریں اور اس کی بندگی کا راستہ اپنائیں تو ان پر اس کی رحمت اور برکات کے دروازے کھل جاتے ہیں اور اگر وہ اللہ تعالیٰ کی بندگی سے انحراف اختیار کریں اور گمراہی کی وادی میں قدم رکھیں اور باطل اندیشہ اور فاسد انگیزہ میں مبتلا ہو جائیں تو معاشرے میں فساد برپا ہو جاتا ہے اور یہ فساد خشکی اور سمندر کو اپنی لپیٹ میں لے لیتا ہے اور ستم، جنگ، ناامنی اور تمام برائیوں کے سبب اقوام کو ہلاکت کے دہانے لا کھڑا کرتا ہے۔ نیز سیلاب، زلزلہ، آسمانی بجلی جیسی خانماں سوز بلاؤں اور مصیبتوں سے انہیں دچار کر دیتا ہے۔ جیسا کہ قرآن کریم سیل عَرِم (16:34)، طوفان نوح (14:29)، ثمود پر آسمانی بجلی (17:41) اور عاد کی صرصر (6:69) کو انہی حوادث میں سے قرار دیتا ہے۔

ناخوشگوار حوادث کی ایجاد میں برے اعمال کی تاثیر پر قرآن کریم کی آیات کے علاوہ بہت سی روایات بھی پائی جاتی ہیں۔ حضرت امام باقر علیہ السلام سے ایک روایت میں نقل ہوا ہے کہ آپ نے فرمایا: " جب ایک معاشرہ گناہوں میں آلودہ ہو جائے تو اللہ تعالیٰ نے ان کے لئے جو بارش لکھی تھی اس سال اسے ان پر نہیں برساتا بلکہ اسے وسیع بیابانوں، سمندروں اور پہاڑوں پر برسا دیتا ہے۔۔۔ پھر فرمایا: "اے بابصیرت لوگو! نصیحت پاؤ۔۔۔ جب لوگ کم فروشی کرنے لگیں تو خداوند انہیں قحط اور فصلوں کی کمی کے عذاب میں مبتلا کر دیتا ہے۔ اور جب وہ زکات ادا نہ کریں تو زمین بھی انہیں زراعت، پھلوں اور اپنی معادن سے محروم کر دیتی ہے اور جب قضاوت میں ظلم کریں اور ظلم و ستم میں ایک دوسرے کی مدد کرنے لگیں اور پیمان شکنی کرنے لگیں تو اللہ تعالیٰ ان پر ان کے دشمنوں کو مسلط کر دے گا اور جب وہ قطع رحم کریں تو ان کے اموال شریر لوگوں کے ہاتھ میں آ جائیں گے..."[10]

بعض روایات کے مطابق: "انّ المؤمن لینوی الذنب فیحرم رزقه"[11] یعنی: "جب ایک مؤمن گناہ کا ارادہ کرتا ہے تو اپنے رزق سے محروم ہو جاتا ہے۔"

انسان کے کردار کے اس کی معیشت کے ساتھ رابطہ پر کئی آیات دلالت کرتی ہیں۔علامہ جوادی آملی کے مطابق سورہ انفال کی آیت ۳۸، سورہ الاسراء کی آیت ۸ اور ۱۶ اور سورہ روم کی آیت ۱۴۱ اس مطلب پر دلالت کرتی ہیں کہ ہمیشہ لوگ فردی اور سماجی گناہوں کے سبب تلخ حوادث اور الٰہی نعمتوں اور برکتوں سے محرومیّت میں مبتلا ہوئے۔ ان کے مطابق ان آیات کا نچوڑ یہ ہے کہ طبیعت کے Disasters کا انسان کے طبیعت کے ساتھ Behavior کے ساتھ گہرا تعلق ہے اور انسان کے ایمان، اس کے تقویٰ اور طرزِ زندگی کا اس کی معیشت پر بہت گہرا اثر مرتب ہوتا ہے۔

اسلام اور ماحولیات

ارشادِ خداوندی ہے: يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اسْتَجِيبُوا لِلّٰهِ وَلِلرَّسُولِ إِذَا دَعَاكُمْ لِمَا يُحْيِيكُمْ (24:8) یعنی: "اے ایمان والو! جب بھی رسول تمہیں کسی ایسے کام کے لئے بلائیں جو تمہیں زندگی عطا کرتا ہے تو اللہ اور رسول کی فرمانبرداری کرو۔" یقینا ایک حیات بخش دین ہونے کے ناطے اسلام انسانی زندگی پر اثر انداز تمام عناصر کا احاطہ کرتا اور ان کی تقویت کرتا ہے۔ ایسے میں اگر آج یہ نکتہ ہر نکتہ داں کے لئے واضح ہے کہ سالم ماحولیات کے بغیر مضبوط معیشت اور صحت مند زندگی کا تصوّر ناممکن ہے تو الٰہی ادیان میں بھی ہماری توجہ ہمیشہ اس امر پر مبذول کروائی کہ ہم ماحولیات کی حفاظت کریں تاکہ اپنی زندگی اور معیشت کی حفاظت کر سکیں۔ علامہ جوادی آملی کے مطابق: " انبیائے الٰہی پر ہمیشہ متنوع شریعتوں اور طریقتوں کی صورت میں ظاہر ہونے والے الٰہی حنیف دین میں ماحولیات کے مسائل کو پہچاننا، اس کا حصول اور اس کی تخریب سے پرہیز اور اسے سالم رکھنے کے لئے کوشش کرنا، روشن ترین انسانی حقوق اور واضح ترین انسانی ذمہ داریوں میں سے شمار ہوتا ہے؛ تاکہ معاشرے کی نشاط کے ہمراہ اُس کی سلامتی اور معاشرے کے افراد کی خوشی کے ہمراہ اُن کی صحت کی ضمانت دی جاسکے۔"[12]

درحقیقت، اسلام، انسان اور ماحولیات کے رابطے کو ارادہ خداوندی سے جوڑ کر ماحولیات کی پاکیزگی کی ایسی لافانی اساس فراہم کرتا ہے جو کوئی الحادی مکتب پیش نہیں کر سکتا۔ اسلام کے مطابق اگر انسان اپنی ماحولیات پر ظلم کرے تو یہ اس کا اپنے خدا کے حق میں ظلم شمار ہوتا ہے۔ اسلامی آئیڈیالوجی میں جس طرح انسان کا وجود ایک امانت کے طور پر اس کے اختیار میں ہے، اسی طرح عالم طبیعت بھی خدا کا مال ہے جو انسان کو بطور امانت سونپا گیا ہے جس میں ناروا تصرف، خدا کے مال اور امانت میں خیانت اور ظلم ہے۔ لہٰذا ایک کافر تو ماحولیات کو آلودہ کرنے میں بے باک ہو سکتا ہے لیکن ایک راسخ العقیدہ مسلمان ایسا کرنے حق نہیں رکھتا۔ اسلامی تعلیمات میں ماحولیات کی حفاظت کو اتنی اہمیت دی ہے کہ ایک درخت کی آبیاری کا ثواب ایسا ہے جیسے ایک تشنہ مؤمن کو سیراب کیا جائے۔ پیغمبر اکرم ﷺ فرماتے ہیں: " من سقى طلحة او سدرة فكانّما سقى

مؤمنا من ظماء"[13] یعنی: "جس نے کیکر یا بیری کے ایک درخت کو سیراب کیا گویا اس نے ایک تشنہ لب مؤمن کو سیراب کیا ہے۔" جب ایک درخت کی آبیاری کا ثواب اتنا ہو جتنا ایک مومن کی پیاس بجھانے کا ثواب ہے تو یقیناً درخت لگانا اور سبزہ اگانا بھی انسان کی اخروی سعادت کا وسیلہ ہے۔

علامہ جوادی آملی کے مطابق ماحولیات کی لغت، انسان کے مقامِ خلافت الٰہیہ کے ساتھ آمیختہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ الٰہی ادیان اور دین مبین اسلام میں گلی، کوچوں اور عوامی مقامات اور فضا کو آلودہ کرنے سے روکا گیا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ آلودہ ماحولیات کو پاک کرنے کی ترغیب دلائی گئی ہے۔ رسول اکرم ﷺ نے فرمایا: "من اماط عن طریق المسلمین ما یؤذیھم کتب اللہ لہ اجر قرائة اربعمائة آیة، کل حرف بعشر حسنات"[14] یعنی: "جو شخص مسلمانوں کے راستے سے وہ چیز جو گذرنے والوں کے لئے اذیت کا موجب ہو، ہٹا دے تو اللہ تعالیٰ اُس کے نامہ اعمال میں چار سو آیت کی تلاوت کا ثواب لکھ دیتا ہے، کہ ہر حرف کی تلاوت کا ثواب دس نیکیوں کے برابر ہے۔" یہاں راستے سے مراد فقط زمینی راستے نہیں، بلکہ اس سے سمندری اور فضائی راستے بھی مراد ہیں۔اسی طرح اذیت دینے والی چیزوں سے مراد بھی فقط عبوری موانع نہیں، بلکہ ہر وہ چیز مراد ہے جو گذرنے والوں کی تکلیف کا سبب بنے اور معاشرے کی نشاط یا سلامتی کے بعض عناصر کو نابود کردے؛ جیسے کوڑا کرکٹ کی بدبو، کارخانوں کا دھواں، صوتی آلودگی اور ٹریفک کا رش بھی آنحضرت کے اس خالص فرمان کا نمونہ ہیں اور ماحولیات کے قوانین کی پابندی ایک دینی مقدس متن کی تلاوت کے تقدس کے ہم وزن ہے۔

امام جعفر صادق علیہ السلام کا ارشاد ہے: "ان اللہ عزّوجل اذا انعم علی عبد نعمة احبّ ان یری علیہ اثرھا، قیل: و کیف ذلك قال: ینظّف ثوبہ و یطیّب ریحہ و یحسن دارہ و یکنس افنیتہ..."[15] یعنی: "اللہ تعالیٰ کو محبوب ہے کہ جب وہ اپنے کسی بندے کو نعمت دے تو اس پر اس نعمت کا اثر نظر آئے۔ آپ سے پوچھا گیا کہ: کیسے؟ تو فرمایا: ایسے شخص کو چاہیے کہ وہ اپنے لباس کو پاکیزہ رکھے، خود کو خوشبو لگائے، اپنا گھر اچھا بنائے اور اپنے صحن کو صاف ستھرا رکھے۔" لہٰذا جو شخص ہوا کی تطہیر کی بجائے اسے آلودہ کرتا ہے اور زمین کی آبادی کی بجائے اسے ویران کرتا ہے اور شجرکاری کی بجائے، درختوں کو کاٹتا ہے اور سمندروں اور صحراؤں کو پاکیزہ رکھنے کی بجائے انہیں آلودہ کرنے میں کوئی آڑ محسوس نہیں کرتا، ایسا اندھا شخص بے دریغ جھوٹ بولتا ہے اور جس طرح ماحولیات کو آلودہ کرتا ہے، اسی طرح خلافتِ الٰہیہ کے باشکوہ عنوان کو بھی آلودہ اور غارت کرتا ہے۔امام سجاد علیہ السلام اگر راستے پر کوئی پتھر، ڈھیلا دیکھتے تو سواری سے اتر کر اسے راستے سے ہٹاتے تاکہ گذرنے والوں کے راستے میں مانع نہ بنے۔[16] حضرت عیسیٰ علیہ السلام ایک قبر کے پاس سے گذر رہے تھے اور دیکھا کہ اس قبر میں

مدفون شخص کو عذاب ہو رہا ہے۔ اگلے سال اسی قبر کے پاس سے گذرتے ہوئے دیکھا کہ اب صاحب قبر پر عذاب نازل نہیں ہو رہا۔ پوچھا: خدایا! اس کے عذاب کے ٹل جانے کا سبب کیا ہے؟ ارشاد ہوا: اس کا بیٹا جوان ہو گیا ہے اور اس نے ایک راستہ بنوایا ہے اور ایک یتیم کو پناہ دی ہے، جس کے نتیجہ میں اس کا گناہ بخش دیا گیا ہے۔[17]

پس دین کے نکتہ نگاہ سے ماحولیات کی پاکیزگی اور سالم زندگی میں گہرا تعلق پایا جاتا ہے۔ جس طرح احتیاط اور حفاظتی تدابیر، علاج و معالجہ پر مقدم ہیں، اسی طرح پاکیزہ ہوا اور مناسب ماحولیاتی کی فراہمی بھی آلودہ ماحولیات کی وجہ سے ہونے والے نقصانات کی تلافی پر مقدم ہیں۔ ماحولیات کی سلامتی کا مطلب زمین، ہوا، پانی، مٹی، صحرا، پہاڑ، ریگستان، نباتات، حیوانات، تمام موجودات کے حقوق کا خیال رکھنا اور اُن ماحولیاتی امور کی پاسداری ہے جن کا معاشرہ کی زندگی سے رابطہ ہے۔ لہٰذا معاشرہ کے عوام اور حکمران، سب کا فریضہ ہے کہ اس اہم ذمہ داری کی انجام دہی میں بھرپور محنت اور تگ و دَو کریں اور ماحولیات کو آلودگی سے بچائیں۔ پیغمبر اکرم ﷺ نے فرمایا: "ثلاث ملعون من فعلهن المتغوط فی ظل النزال، والمانع الماء المنتاب و ساد الطریق المسلوك"[18] یعنی: " تین طبقے اپنے ناروا کاموں کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کی لعنت کے مستحق ہیں: الف) جو عوامی مقامات، سایہ بانوں، پارکوں اور مسافروں کی آرامگاہوں کو آلودہ کریں۔ ب) جو باری کے پانی کو غصب کریں؛ یعنی دوسروں کے باری کا خیال نہ رکھیں۔ ج) جو راستہ روکیں اور گذرنے والوں کے لئے رکاوٹیں کھڑی کریں۔"

اسلامی تعلیمات میں جہاں ماحولیات کی پاکیزگی کو بہت اہمیت دی گئی ہے وہاں اسے آلودہ کرنے کی بھرپور مذمت کی گئی ہے۔ اسلام کے نکتہ نگاہ سے ماحولیات کو آلودہ کرنے والا ابلیس سے کم نہیں۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے: وَاِذَا تَوَلّٰی سَعٰی فِی الْاَرْضِ لِیُفْسِدَ فِیْهَا وَ یُهْلِكَ الْحَرْثَ وَالنَّسْلَ وَاللّٰهُ لَا یُحِبُّ الْفَسَادَ (2:205) یعنی: "اور جب وہ لوٹتا ہے تو زمین میں فساد انگیزی اور کھیتیاں اور جانیں تباہ کرنے کے لئے بھاگ دوڑ کرتا ہے، اور اللہ فساد کو پسند نہیں فرماتا۔" اس آیت کی تفسیر میں علامہ جوادی آملی کا مدعا یہ ہے کہ ہر عامل کی قدر و قیمت کا دارومدار اُس کے عمل پر ہے اور جب عمل (فساد) محبوب نہ ہو تو عمل انجام دینے والا بھی محبوب نہیں ہو سکتا بلکہ مبغوض ہو گا۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم نے مذکورہ بالا آیت میں زمین میں فساد پھیلانے اور طبیعی وسائل کو برباد کرنے کی نسبت ابلیسی نظام اور طاغوتی حکمرانوں کی طرف دی ہے جو طبیعی وسائل سے ذاتی بہرہ مندی کے درپے ہوتے ہیں اور اگر ان وسائل سے دوسرے لوگوں کو فائدہ اٹھاتا دیکھیں تو انہیں نابود کرنے کی تگ و دَو کرتے اور کرہ ارض پر تباہی مچاتے ہیں: اِنَّ الْمُلُوْكَ اِذَا دَخَلُوْا قَرْیَةً اَفْسَدُوْهَا (27:34) یعنی: "بے شک جب بادشاہ کسی بستی میں داخل ہوتے ہیں تو اسے تباہ و برباد کر دیتے ہیں۔"

آج عالم انسانیت کا المیہ یہی ہے کہ اسی خُلق و خُوکے مالک سیاسی نظام اور حکمران ماحولیات کی حفاظت کے علمبر دار بنے پھرتے ہیں۔ حالانکہ علامہ جوادی آملی کے بقول ماحولیات کی حفاظت اور انسان کی سلامتی کے باب میں ہر حق بات، ابراہیمی انبیاء کے پیغام سے ماخوذ ہے۔ ادیان الٰہی میں سالم ماحولیات انسان کا حق ہے اور اس کی حفاظت انسان کا فرض۔ قرآن اور دینی پیشواوں کے فرمان میں انسان کی زندگی کی اصلاح اور ماحولیات کی سلامتی پر خاص توجہ دی گئی ہے۔ قدرتی ماحولیات کا تحفظ ایک طرف انسان کا بنیادی حق اور دوسری طرف، انسانی فریضہ شمار ہوتا ہے۔ لیکن اس حق و فرض سے عدم آشنائی اس سے کوتاہی کا اصل موجب ہے۔ پس ایک دیندار معاشرہ کے لئے ضروری ہے کہ وہ عالم آفرینش کو محض نیچر کے طور پر نہ لے اور اس سے ہر جائز و ناجائز استفادے کو اپنا حق نہ سمجھے۔ بلکہ اسے اللہ تعالیٰ کی تخلیق اور اپنی حیات و بقاء کی شرط قرار دیتے ہوئے اس کی حفاظت کو اپنی ذمہ داری سمجھے۔ ہمیں معلوم ہونا چاہیے کہ قرآن کریم نے اس کرہ ارضی اور اس کی ماحولیات کو انسانی حیات کی پرورش گاہ قرار دیا ہے۔ ارشاد باری تعالی ہے: أَلَمْ نَجْعَلِ الْأَرْضَ مِهَادًا (78: 6) یعنی: "کیا ہم نے زمین کو (زندگی کے) قیام اور کسب و عمل کی جگہ نہیں بنایا؟"

پس دین کے منظر سے عالمِ آفرینش کی خوبصورت مصوّری انسانی زندگی کی گود اور انسان کے ہاتھوں میں اللہ تعالیٰ کی امانت ہے۔اور اس امانت کی حفاظت وہی کر سکتا ہے جو حقیقی معنوں میں دیندار ہو۔ اگر ایک انسان یا انسانی معاشرہ صاحب دین و ایمان نہ ہو تو اپنے منافع کے حصول کے لئے تمام ماحولیاتی فرائض سے پہلو تہی کرتا اور ماحولیات کو آلودہ کرنے میں کوئی عار محسوس نہیں کرتا۔آج بے دین ترقی یافتہ ممالک اپنے اقتدار کی ہوس کے نشے میں ڈوب کر سمندروں اور صحراؤں میں ایٹمی اور غیر ایٹمی دھماکوں اور کیمیاوی تجربات کے ذریعے ماحولیات کو بری طرح آلودہ کر رہے ہیں جس سے آبی اور خاکی مخلوقات کی جانیں خطرے میں ہیں۔ حالانکہ سائنس، صنعت اور ٹیکنالوجی کا فریضہ انسان کی زندگی، معیشت اور ماحولیات کا سامان فراہم کرنا اور آبی و خاکی مخلوقات کی حفاظت اور عالم طبیعت کے مظاہر کی حفاظت ہے۔ ایسے میں یہ دینی تعلیمات ہی ہیں جو بنی نوع بشر کو اُس کی حیات کا ماحول، مضبوط معیشت اور پاکیزہ ماحولیات فراہم کر سکتی ہیں۔ بنابریں، ہر دیندار کا یہ فرض ہے کہ وہ معیشت و ماحولیات کے حوالے سے دین کی تعلیمات کو پوری دقّت کے ساتھ سمجھے، ان پر عمل پیرا ہو اور پوری انسانیت تک دین کا یہ پیغام پہنچائے۔

*****

حوالہ جات

1۔جوادی آملی، عبد اللہ، *اسلام و محیط زیست*؛ تحقیق و تنظیم عباس رحیمیان، نشر اسراء، قم، ۱۳۸۶۔ اس کتاب کا اردو ترجمہ راقم الحروف کے قلم سے "*اسلام اور ماحولیات* "کے عنوان سے چھپ کر منظر عام پر آ چکا ہے۔

2 ۔ عبد اللہ، جوادی آملی، *اسلام اور ماحولیات*، مترجم ڈاکٹر شیخ محمد حسنین، لاہور، مصباح القرآن ٹرسٹ، 2017:76۔

3 ۔ایضا: 36-35۔

4 ۔ایضا:42۔

5 ۔ محمد بن حسن، الحرّ عاملی، *وسائل الشیعہ*، ج17 (قم، آل البیت،1414ہجری) 40۔

6 ۔ایضا، ج12: 11۔

7 ۔ جوادی آملی، *اسلام اور ماحولیات*: 9-68۔

8 ۔ایضا:63۔

9 ۔الفضل،، ابو علی، ابن الحسن الطبرسی، *مجمع البیان*، (بیروت، دار المرتضیٰ،2006) ج3-4: 8-697۔

10 ۔ محمد بن علی، الشیخ الصدوق، *ثواب الاعمال و عقاب الاعمال*، (قم، منشورات الرضی،1368ھ، ش) 252۔

11 ۔ایضا:241۔

12 ۔ جوادی آملی، *اسلام اور ماحولیات*: 106۔

13۔علامہ محمد باقر، مجلسی، *بحار الانوار*، ج9 (بیروت، دار احیاء التراث العربی،1403ق) 217۔

14 ۔ایضاً: ج75: 50۔

15 ۔ایضاً، ج76: 175-176۔

16 ۔ایضاً، ج74: 50۔

17 ۔ایضاً:49۔

18 ۔الحر العاملی، *وسائل الشیعہ*، ج1، ص325۔

کتابیات

1) جوادی آملی، عبد اللہ، *اسلام اور ماحولیات*، مترجم ڈاکٹر شیخ محمد حسنین، لاہور، مصباح القرآن ٹرسٹ، 2017۔

2) الحرّ عاملی، محمد بن حسن، *وسائل الشیعہ*، ج17، قم، آل البیت،1414ہجری۔

3) الفضل، ابو علی، ابن الحسن الطبرسی، *مجمع البیان*، بیروت، دار المرتضیٰ،2006) ج3-4۔

4) الشیخ الصدوق، محمد بن علی، *ثواب الاعمال و عقاب الاعمال*، قم، منشورات الرضی،1368ھ۔

5) مجلسی، علامہ محمد باقر، *بحار الانوار*، ج9، بیروت، دار احیاء التراث العربی،1403ق۔

قرآن وحدیث کی روشنی میں
تکریمِ فاطمہ سلام اللہ علیہا

THE DIGNITY OF HAZRAT FATIMA (a.s)
(From the viewpoint of the Quran and Tradition)

Dr. Sajjad Ali Raeesi
Dr. Sh. M. Hasnain

Abstract:
No doubt the dignity and propriety of the Prophet's descendants is the duty of all Muslims. Likewise, there is no doubt that Hazrat Fatima Zahra (as) is the daughter of Holy Prophet and she is the head of the women of the all worlds (Here & Hereafter). Fatima Zahras' position is so high that you are an obvious sample of Surah "Al-Kusar". After all, your respect is as the respect to Holy prophet (PBUH) and your humiliation is equivalent to the humiliation of the Holy Prophet. This essay discusses the essence of the dignity and respect towards Hazrat Fatima (as), in the light of your Quran and Sunnah.
Keywords: *Prophet (as), Descendants, Hazrat Fatima (as), Dignity.*

خلاصہ
پیغمبر اکرم ﷺ کی اولاد کی تعظیم و تکریم سب مسلمانوں پر فرض ہے اور اس میں کسی کو کوئی شک نہیں ہے۔ اسی طرح جناب فاطمہ زہرا سلام اللہ علیہا کے رسول اکرم ﷺ کی بیٹی اور عالمین کی عورتوں کی سردار ہونے میں بھی کسی کو کوئی شک نہیں ہے۔ آپ کا مقام و مرتبہ اتنا بلند ہے کہ آپ سورہ مبارکہ "الکوثر" کا واضح مصداق ہیں۔ بنابریں، آپ کی تعظیم و تکریم گویا خود رسول خدا ﷺ کی تعظیم و تکریم ہے اور آپ کی توہین، رسولخدا ﷺ کی شان میں گستاخی کے مترادف ہے۔ مقالہ ہذا میں آپ قرآن و سنت کی روشنی میں آپ کی تعظیم و تکریم کے لزوم پر بحث کی گئی ہے۔
کلیدی الفاظ: رسول اکرم ﷺ، اولاد، حضرت فاطمہ زہرا (س)، تعظیم۔

اولاد رسول ﷺ کی تکریم

پیغمبر اکرم ﷺ سے منقول ہے کہ آپ نے فرمایا: حقّت شفاعتی لمن أعان ذرّیّتی بیده ولسانه وماله۔ یعنی: "جس نے میری اولاد کی اپنے ہاتھ، زبان اور مال سے مدد کی اس کے لئے میری شفاعت تحقق پا چکی۔" نیز منقول ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: من أکرم أولادی فقد أکرمنی۔ یعنی: "جس نے میری اولاد کی تکریم کی گویا اس نے میری تکریم کی ہے۔" ایک اور حدیث میں منقول ہے: أیما رجل صنع إلی رجل من ولدی صنیعه فلم یکافئه علیها فأنا المکافئ له علیها یعنی: "جس نے میری اولاد میں سے کسی کے ساتھ نیکی کی اور میری اولاد نے اسے کوئی بدلہ نہ دیا تو میں اسے اس کی نیکی کا بدلہ دوں گا۔ایک اور حدیث میں منقول ہے کہ فرمایا: من وصل أحدا من أهل بیتی فی دار الدنیا بقیراط کافیته یوم القیامة بقنطار۔ یعنی: "جس نے میرے اہل بیت میں سے کسی کے ساتھ ایک قیراط کی بھلائی کی میں قیامت کے دن اس کے ساتھ ایک خزانہ بھلائی کروں گا۔"[1]

امام صادق علیہ السلام سے منقول ہے کہ: "قیامت کے دن منادی ندا دے گا: اے لوگو! خاموش ہو جاو کہ محمد ﷺ تم سے بات کرنا چاہتے ہیں۔ لوگ خاموش ہو جائیں گے تو نبی اکرم ﷺ کھڑے ہو کر فرمائیں گے: "لوگو! اگر کسی کا مجھ پر کوئی فرض ہو، اگر کسی کی میرے ساتھ کوئی اچھائی ہو، اگر کسی کا مجھ پر کوئی احسان ہو تو وہ کھڑا ہو جائے تاکہ میں اسے بدلہ دوں۔" لوگ جواب دیں گے کہ ہمارے ماں، باپ آپ پر فدا! بھلا ہمارا آپ پر کیا فرض، نیکی یا احسان ہو سکتا ہے؟ بلکہ تمام مخلوقات پر فرض، نیکی اور احسان تو اللہ تعالیٰ اور اللہ کے رسول کا ہے۔اس پر آپ ﷺ فرمائیں گے: "ہاں! جس نے میرے اہل بیت میں سے کسی کو پناہ دی، یا کسی کے ساتھ نیکی کی، یا کسی بے لباس کو لباس پہنایا یا کسی بھوکے کو کھانا کھلایا ہو تو وہ کھڑا ہو جائے تاکہ میں اسے بدلہ دوں۔" یہ سن کر وہ لوگ اٹھ کھڑے ہوں گے جنہوں نے ایسا کیا ہوگا۔ اتنے میں بارگاہ ربوبی سے آواز آئے گی: "اے محمد! اے میرے حبیب! میں نے ان لوگوں کا بدلہ آپ پر چھوڑا ہے۔ انہیں جنت میں جہاں چاہو، ٹھہرا دو۔" اس پر آپ ان لوگوں کو ایک ایسے مقام پر ٹھہرائیں گے جہاں ان کے اور محمد و اہل بیت محمد علیہم السلام کے درمیان کوئی حجاب نہ ہوگا۔"[2]

حضرت فاطمہ علیہا السلام کی تکریم

مذکورہ بالا روایات کی روشنی میں اولاد رسول ﷺ کی تکریم کی اہمیت اجاگر ہو چکی ہے۔ اولاد رسول کا وہ مصداق جس کے اولاد اور اہل بیت رسول ﷺ ہونے میں کسی کو کوئی شک نہیں ہے، حضرت فاطمہ زہرا سلام اللہ علیہا ہیں۔ آپ کی فضیلت میں قرآن مجید میں متعدد سورتیں اور آیات موجود ہیں۔ سورہ دہر، سورہ الاحزاب آیت

33 و 56، سورہ الشوری آیت 23، سورہ آل عمران آیت 61 کی تعبیر و تشریح میں خصوصیت کے ساتھ آپ کا تذکرہ ملتا ہے۔ آپ رسولخدا ﷺ کی وہ اولاد ہیں جس کی بشارت خداوند تعالیٰ نے آپ کو سورہ مبارکہ "الکوثر" میں دی ہے۔ بنابریں، حضرت فاطمہ سلام اللہ علیہا کی تکریم، اولاد رسول ﷺ کی تکریم کا سب سے اظہر و اکمل مصداق ہے۔ حضرت فاطمہ سلام اللہ علیہا کی عظمت و رفعت اور آپ کی تعظیم و تکریم کے وجوب پر امت مسلمہ میں مکمل اتفاق پایا جاتا ہے۔ حضرت فاطمہ زہرا سلام اللہ علیہا کی ولادت بعثت کے پانچویں سال 20 جمادی الثانی 3 کو مکہ المکرمہ میں ہوئی۔ آپؑ نے بہت زیادہ عمر نہیں پائی بلکہ کم عمری میں ہی اس دنیا سے رخصت ہوئیں۔ آپ کی رحلت کی تاریخ کے حوالے سے مورخین میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ تاریخ میں آپ کی کم از کم عمر اٹھارہ اور زیادہ سے زیادہ چوبیس سال لکھی گئی ہے۔ زیادہ تر مورخین نے آپؑ کی عمر مبارک چوبیس سال لکھی ہے۔ 4 دراصل، فاطمہ زہرا سلام اللہ علیہا اپنے بابا کی رحلت کے بعد ہمیشہ اتنے غم و اندوہ میں رہیں۔ جیسے کہ شیخ طوسی لکھتے ہیں: "رسول اکرم ﷺ کی رحلت کے بعد پیش آنے والے ناخوشگوار واقعات میں جسمانی اور روحانی دونوں اعتبار سے مجروح ہونے اور کچھ مدت تک بیمار رہنے کے بعد آخرکار حضرت فاطمہ زہرا سن 11 ہجری میں اس دنیا سے رخصت ہو گئیں۔" [5]

آپ حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کی دختر نیک اختر اور کائنات کی عظیم تر خاتون ہیں۔ آپ کائنات کی وہ عظیم خاتون ہیں جنہیں پیغمبر اکرم ﷺ نے کائنات کی سیدہ قرار دیا ہے۔ اس سلسلے میں ایک روایت الفاظ کے اختلاف کے ساتھ اکثر بنیادی کتب احادیث میں نقل ہوئی ہے۔ جیسے کہ صاحب بحار الانوار نے حدیث کو یوں نقل کیا ہے۔ "أنّ رسول الله قال: فاطمة سيدة نساء العالمين من الأولين والآخرين، وإنّها لتقوم في محرابها فيسلم عليها سبعون ألف ملك من المقربين، وينادونها بما نادت به الملائكة مريم فيقولون: يا فاطمة إنّ الله اصطفاك وطهرك واصطفاك على نساء العالمين" [6] یعنی: "رسول اللہ نے فرمایا: "فاطمہ اولین وآخرین کی عورتوں کی سردار ہیں اور بے شک جب آپ محراب میں کھڑی ہوتی ہیں تو ستر ہزار مقرب ملائیکہ آپ پر سلام بھیجتے اور آپ کو ویسی ندا دیتے ہیں جیسی مریم کو دی۔ لہٰذا ملائیکہ کہتے ہیں: "اے فاطمہ! اللہ تعالیٰ نے آپ کا انتخاب کیا ہے اور آپ کو پاکیزگی عطا کی ہے اور آپ کو تمام جہانوں کی عورتوں پر برتری دی ہے۔" صحیح بخاری میں یہ حدیث یوں نقل ہوئی ہے: "اما ترضين ان تكوني سيدة نساء اهل الجنة او نساء المؤمنين فضحكت لذلك" [7] یعنی: "آیا آپ اس پر راضی نہیں کہ اہل جنت کی عورتوں یا مومنین کی عورتوں کی سردار ہیں! تو آپ اس پر ہنسیں۔" یہی وجہ ہے کہ آپ کی سیرت نہ صرف خواتین کے لئے بلکہ پوری انسانیت کے لئے نمونہ عمل ہے۔

اسی طرح پیغمبر اکرم ﷺ نے بھی اپنے متعدد فرامین میں آپ کی عظمت و رفعت کو بیان کرتے ہوئے آپ سے محبت کو خدا سے محبت اور آپ سے نفرت کو خدا سے نفرت قرار دیا ہے۔"ان الله يغضب لغضبك و يرضى لرضاك" بے شک خدا آپ کے غضبناک ہونے سے غصے میں آتا ہے اور آپ کی خوشنودی سے خوش ہوتا ہے۔"[8] الفاظ کے اختلاف کے ساتھ اس سے ملتی جلتی ایک اور روایت کو اکثر محدثین نے لکھا ہے: "فاطمه بُضْعَةٌ مِّنِّیْ فَمَنْ اَغْضَبَهَا اَغْضَبَنِیْ وَفِیْ رِوَایَةٍ یُرِیْبُنِیْ مَا اَرَابَهَا وَیُوْذِیْنِیْ مَا اٰذَاهَا "[9] یعنی: "حضرت فاطمہ (سلام اللہ علیہا) میرا ٹکڑا ہے جس نے انہیں ناراض کیا اُس نے مجھے ناراض کیا اور ایک روایت میں ہے جو چیز اِنہیں پریشان کرے مجھے پریشان کرتی ہے اور جو اِنہیں تکلیف دے وہ مجھے ستاتا ہے۔ بنابریں، آپ ﷺ کی احادیث سے یہ بات قطعی طور پر ثابت ہوتی ہے کہ حضرت فاطمہ زہرا سلام اللہ علیہا کی خوشی اور غم درحقیقت رسول اکرم ﷺ کی خوشی اور غم ہے۔

حضرت فاطمہ زہرا سلام اللہ علیہا کی تعظیم و تکریم اس حد تک لازم ہے کہ مستند روایات کی روشنی میں اگر کوئی آپ کی شان میں لفظاً، اشارتاً یا کنایتاً بھی توہین کرے تو وہ شخص نہ صرف گناہ کبیرہ کا مرتکب ہوتا ہے بلکہ یہ اس کے لئے کفر کا باعث بھی ہے۔ حضرت صائم چشتی "مواہب اللدنیہ میں" رقم طراز ہیں کہ: سیدۃ النساء العالمین سیدہ فاطمہ زہرا سلام علیہا کو حضور سرور عالم ﷺ نے بضعۃ (اپنا ٹکڑا) فرمایا۔ کہ جس سے ایک مراد گوشت کا ٹکڑا ہے اور اِسی سے امام سہیلی نے استدلال کیا ہے کہ چونکہ سیدہ فاطمہ زہرا صلوٰۃ اللہ علیہا امام الانبیاء ﷺ کے گوشت کا ٹکڑا ہیں اس لئے آپ کی شان میں گستاخی کرنا کفر صریح ہے۔"[10]

یہاں اس سوال کا جواب دینا بھی ضروری ہے جو بعض مورخین اور علماء نے پیش کیا ہے کہ جب آپ رحمت اللعالمین ﷺ کی بضعہ، ٹکڑا اور لخت جگر ہیں تو یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ آپؑ کسی پر غضبناک ہوں یا کسی کو بد دعا دیں۔ کیونکہ آپ اس عظیم باپ کی بیٹی ہیں جن کو قبیلہ دوس نے جسمانی تشدد کرکے اتنا زخمی کیا کہ خون سے نعلین مبارک بھر گئے لیکن آپ دعا دیتے نظر آئے: اَللّٰھُمَّ اھدِ دَوسا۔ یعنی: "اے اللہ قبیلہ دوس کی ہدایت فرما"۔[11] لہٰذا یہ کیسے ممکن ہے کہ آپ ﷺ کی دختر نیک فاطمہ زہرا سلام اللہ علیہا کسی کو بد دعا دیں؟ اس سوال کے جواب میں یہ یاد رہے کہ عفوو درگزر سے پیش آنا آپ ﷺ کی ایک اہم صفت ضرور ہے لیکن اس کا ہرگز مطلب یہ نہیں ہے کہ ہر عام و خاص کو آپ ﷺ کی توہین کی اجازت دے دی جائے۔ نیز اس سوال کا جواب تلاش کرنے سے پہلے بد دعا کا مفہوم بیان کرنا ضروری ہے۔ یہ تاثر غلط ہے کہ بد دعا الفاظ میں دی جائے تو تب اس کا اثر ہوتا ہے۔ بد دعا دی نہیں جاتی بلکہ بد دعا ایک حسی ملکہ ہے جو کسی بھی انسان کے دل دکھانے پر اثر دکھاتا ہے۔ اگر اولاد، والدین کے ساتھ احسان سے پیش نہ آئے اور والدین کے حوالے سے اپنی ذمہ داریوں

کا احساس نہ کرے اور والدین بھی علی الاعلان اپنی ناراضگی کا اظہار نہ کریں پھر بھی والدین کے ساتھ یہ برتاؤ بد دعا کا سبب بن جاتا ہے۔ مثال کے طور پر اگر کوئی بد بخت بیٹا ماں کو قتل کرنے کی غرض سے کنویں میں پھینک دے اور پھر اس خیال سے کہ ماں مر گئی ہے، اس کنویں میں جھانک کر دیکھنے کی کوشش کرے اور کنویں سے ماں شدت محبت میں آواز دے کہ میرے بیٹے پیچھے ہٹو کہیں کنویں میں گر نہ جانا تو کیا کوئی یہ کہہ سکتا ہے کہ ماں کی ایسے بیٹے کے حق میں دعا کا مطلب یہ ہے کہ بیٹا اب بھی لائق اور اور ماں کا عاق نہیں ہوا؟ یقینا ماں کی اس محبت کا مطلب یہ نہیں کہ اس کے بیٹے کا یہ سلوک اس کی دنیا و آخرت کی بربادی کا باعث نہ ہو۔ لہٰذا یہ کیسے ممکن ہے کہ وہ لوگ جو ان مقدس ہستیوں کو اذیت دیں اور ان کی توہین کریں جن کی اطاعت و فرمانبرداری امت پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے فرض کی گئی ہو اور اس کے بعد بھی ان لوگوں کی مغفرت ہو جائے؟ ایسے لوگوں کو اگر یہ ہستیاں بد عا نہ بھی دیں تب بھی ان کو دنیا و آخرت میں رسوا ہونا پڑے گا۔

سیرت نبوی ﷺ کا گہرائی سے مطالعہ کیا جائے تو یہ بات عیاں ہو جاتی ہے کہ حضرت محمد ﷺ اور ان کے اہل بیتؑ کی توہین کرنے والے نہ صرف آخرت بلکہ دنیا میں بھی ذلیل و خوار ہیں اور اسلامی ریاست قائم ہو تو ایسے لوگوں کو عملی طور پر سزائیں بھی دی جا سکتی ہیں۔ بعض لوگوں کا یہ خیال ہے کہ چونکہ حضرت محمد ﷺ رحمت للعالمین ہیں اس لئے کوئی جیسے چاہیے توہین کرے اس کو سزا نہیں دی جا سکتی ہے، انتہائی غلط اور بھیانک ہے۔ حضرت محمد ﷺ جب تک مکے میں رہے کسی کو عملی طور پر جرم کی سزا نہیں دی کیونکہ وہاں پر مشرکین مکہ کی حکومت تھی جس کی وجہ سے آپ کے احکامات کی تنفیذ ممکن نہیں تھی لیکن مدینہ میں اسلامی ریاست کے قیام کے بعد ایسے بہت سارے لوگوں کو سزائیں دی گئیں جو حضرت محمد ﷺ اور ان کے اہل بیتؑ کی توہین کے مرتکب ہوئے تھے۔ البتہ یہ سزائیں سب کو نہیں بلکہ مخصوص لوگوں کو دی گئیں۔ زیادہ تر معاندین اسلام کو معاف کیا گیا ہے۔ یقیناً رسول اکرم ﷺ ان عام لوگوں کو معاف کیا کرتے تھے جو مفسدین کی مکارانہ سازشوں کے شکار ہو کر دین اسلام کے مخالف ہوتے تھے لیکن کلیدی کردار ادا کرنے والوں کو مطلقاً معاف نہیں کرتے تھے۔ اس کا بین ثبوت فتح مکہ کے موقعہ پر ملتا ہے جب آپ نے عمومی معافی کا اعلان کیا وہیں پر کچھ مخصوص لوگوں کو سزائیں بھی دیں۔

صاحب الرحیق المختوم نے فتح مکہ کے واقعے کو یوں بیان کیا ہے: "قریش مسجد حرام میں صفیں لگائے کھچا کھچ بھرے تھے۔ انہیں انتظار تھا کہ آپ ﷺ کیا کرتے ہیں۔۔۔اس کے بعد آپ ﷺ فرمایا: قریش کے لوگو! تمہارا کیا خیال ہے۔ میں تمہارے ساتھ کیسا سلوک کرنے والا ہوں؟ انہوں نے کہا: آپ ﷺ کریم ہیں اور کریم بھائی کے صاحبزادے ہیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا۔ تو میں تم سے وہی بات کہہ رہا ہوں جو یوسف علیہ السلام نے اپنے بھائیوں سے کہی تھی کہ لَا تَثْرِيبَ عَلَيْكُمُ الْيَوْمَ (12: 92) آج تم پر کوئی سرزنش نہیں، جاؤ تم سب آزاد ہو۔"[12]

لیکن فتح مکہ کے موقعہ پر جہاں ایک طرف عمومی معافی کا اعلان ہوا تو وہیں پر "فتح مکہ کے روز رسول اللہ ﷺ نے اکابر مجرمین میں سے نو آدمیوں کا خون رائیگاں قرار دیتے ہوئے حکم دیا کہ اگر وہ کعبے کے پردے کے نیچے بھی پائے جائیں تو انہیں قتل کر دیا جائے۔"[13] آپ ﷺ کے اس حکم کے پر عمل کرتے ہوئے ان میں سے کچھ کو قتل بھی کیا گیا جن میں دو خواتین بھی شامل تھیں کہ جنہیں سزائے موت دی گئی۔ مورخین کے نزدیک قتل ہونے والی خواتین رسول اکرم ﷺ اور مسلمانوں کے خلاف ہجوانہ (توہین آمیز) کلام بکا کرتی تھی۔ لہٰذا سیرت مصطفیٰ ﷺ کی ایک خاص خصوصیت یہ ہے کہ وہ عفو و درگزر سے کام لیتے ہیں لیکن جن افراد نے حضرت محمد ﷺ اور ان کے اہل بیتؑ کی توہین کرنے میں کلیدی کردار ادا کیا انہیں آپ نے اپنی زندگی میں بھی معاف نہیں کیا بلکہ انہیں سزائیں دی ہیں۔

یہ حکم قرآن مجید سے ثابت ہوتا ہے کہ عداوت رکھنے والے لوگوں میں کچھ ایسے ہوتے ہیں جو اسلام اور اہل اسلام کے خلاف لوگوں کو ابھارتے ہیں اور مقدسات کی توہین میں دوسروں کے مقابلے میں پیش پیش ہوتے ہیں وہ کسی صورت میں کسی چیز کا پاس رکھنے کے لئے تیار نہیں ہوتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ایسے لوگوں کو ائمۃ الکفر یعنی کفر کے امام سے تعبیر کیا ہے اور آئمۃ الکفر کے قتل کا حکم دیا ہے " فَقَاتِلُواْ أَئِمَّةَ الْكُفْرِ إِنَّهُمْ لاَ أَيْمَانَ لَهُمْ لَعَلَّهُمْ يَنتَهُونَ۔"(9: 12) البتہ ہر خاص و عام کو انفرادی یا اجتماعی طور پر یہ حق حاصل نہیں ہے کہ وہ ائمۃ الکفر کا تعین کرکے انہیں سزائیں دیں۔ شرعی اعتبار سے یہ حق صرف اور صرف حکومت وقت (بعض کے نزدیک صرف اسلامی حکومت) کو حاصل ہے کہ وہ ائمۃ الکفر کا تعین کرے اور انہیں سزائیں دینے پر عمل درآمد کریں۔ یہاں تک کہ حکومت وقت کو بھی ائمۃ الکفر کو سزائیں دینے میں شرعی حدود و قیود کا لحاظ رکھنا انتہائی ضروری ہے۔

بنابریں، یہ دعویٰ ایک سراسر فکری انحراف ہے کہ رسول اکرم ﷺ رحمت اللعالمین ہیں اس لئے وہ ہر خاص و عام کو معاف فرماتے تھے جو ان کی اور ان کے اہل بیتؑ کی توہین کرتے تھے یا توہین کا سبب بنتے تھے۔ مکی زندگی میں رسول اکرم ﷺ کی توہین کا سبب بننے والے افراد جنہیں قرآنی اصطلاح میں "ائمۃ الکفر" کہا گیا ہے وہ مخصوص اور متعین افراد تھے، باقی لوگ ان کی مفسدانہ تبلیغ کے زیر اثر تھے۔ مشہور مورخ و سیرت نگار صفی الرحمٰن مبارکپوری نے اپنی کتاب الرحیق المختوم میں لکھا ہے کہ ایک دفعہ قریش (ائمہ الکفر میں سے چھ) کے چند افراد خانہ کعبہ کے چبوترے میں بیٹے ہوئے تھے کہ رسول اکرم ﷺ نماز کی ادائیگی کے لئے مسجد الحرام کی طرف تشریف لائے اور جیسے آپ ﷺ سجدہ میں چلے گئے ابو جہل کے کہنے پر عقبہ بن ابی معیط نے آپ ﷺ کی پیٹھ مبارک پر اونٹ کی اوجھڑی ڈال دی۔ اس سلسلے میں مشہور روایت حضرت عبداللہ بن مسعود سے موجود ہے۔ صحیح بخاری و مسلم میں بھی یہ روایت آئی ہے۔ "عَنْ عَبْدِ اللهِ۔ قَالَ كَانَ النَّبِيُّ صلى الله عليه وسلم۔ يُصَلِّي فِي ظِلِّ

الْكَعْبَةِ ، فَقَالَ أَبُو جَهْلٍ وَنَاسٌ مِنْ قُرَيْشٍ ، وَنُحِرَتْ جَزُورٌ بِنَاحِيَةِ مَكَّةَ ، فَأَرْسَلُوا فَجَاءُوا مِنْ سَلاَهَا ، وَطَرَحُوهُ عَلَيْهِ ، فَجَاءَتْ فاطمہ فَأَلْقَتْهُ عَنْهُ ، فَقَالَ۔ اللَّهُمَّ عَلَيْكَ بِقُرَيْشٍ ، اللَّهُمَّ عَلَيْكَ بِقُرَيْشٍ ، اللَّهُمَّ عَلَيْكَ بِقُرَيْشٍ۔ لأَبِي جَهْلِ بْنِ هِشَامٍ ، وَعُتْبَةَ بْنِ رَبِيعَةَ ، وَشَيْبَةَ بْنِ رَبِيعَةَ ، وَالْوَلِيدِ بْنِ عُتْبَةَ ، وَأُبَيِّ بْنِ خَلَفٍ ، وَعُقْبَةَ بْنِ أَبِي مُعَيْطٍ ۔ قَالَ عَبْدُ اللهِ فَلَقَدْ رَأَيْتُهُمْ فِي قَلِيبِ بَدْرٍ قَتْلَى ۔ قَالَ أَبُو إِسْحَاقَ وَنَسِيتُ السَّابِعَ ۔ وَقَالَ يُوسُفُ بْنُ إِسْحَاقَ عَنْ أَبِي إِسْحَاقَ أُمَيَّةُ بْنُ خَلَفٍ۔ وَقَالَ شُعْبَةُ أُمَيَّةُ أَوْ أُبَيٌّ ۔ وَالصَّحِيحُ أُمَيَّةُ۔[14] اس روایت کے مطابق ابو جہل اور اس کے ساتھیوں کی سازش سے عقبہ بن ابی معیط نے آپ ﷺ پر حالت سجدہ میں اونٹ کی اوجھڑی ڈال دی تھی۔ حضرت فاطمہ زہراؑ کو اس بات کی خبر ہوئی تو آپ نے آکر اوجھڑی کو اپنے بابا کی پیٹھ سے ہٹا دی اور ان بدبختوں کی طرف متوجہ ہو کر بد دعا کی یہاں تک کہ رسول اللہ ﷺ نے بھی (اپنی بیٹی کے ساتھ مل کر) تین بار ان پر لعنت کی، (چبوترے میں بیٹھے لوگوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا) اے اللہ تو قریش کو پکڑ لے۔ پھر آپ ﷺ نے نام لے کر بد دعا کی اے اللہ ابو جہل کو پکڑ لے اور عتبہ بن ربیعہ، شیبہ بن ربیعہ، ولید بن عتبہ، امیّہ بن خلف اور عقبہ بن ابی معیط کو پکڑ لے۔

ابن مسعود روایت کرتے ہیں۔ "قال عبد الله : فوالذی أنزل الكتاب ، لقد رأيتهم جميعا يوم بدر في قليب واحد۔ یعنی: "اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے میں نے دیکھا کہ جن لوگوں کے نام رسول اللہ ﷺ نے گن گن کر لیے تھے۔ سب کے سب بدر کے کنویں میں مقتول پڑے ہوئے تھے۔"[15] اکثر مورخین اور محققین حیرت زدہ ہیں کہ جنگ احد میں مسلمانوں کی تعداد بھی اچھی خاصی تھی جنگی تیاری بھی تھی، جنگ لڑنے کا تجربہ بھی تھا اور ارادہ بھی لیکن اس کے باوجود مسلمانوں کو شکست کا سامنا کرنا پڑا جبکہ جنگ بدر اسلام کی پہلی جنگ ہے جو ہجرت کے دوسرے سال لڑی گئی ہے۔ جنگ بدر میں مسلمانوں کی تعداد بھی بہت کم، جنگ لڑنے کی کوئی تیاری بھی نہیں، جنگی ساز و سامان بھی نہیں، جنگ لڑنے کا ارادہ بھی نہیں، جنگ لڑنے کا تجربہ بھی نہیں نیز مقابلے میں ایک تجربہ کار جنگجوؤں کی ایک کثیر تعداد اور پوری تیاری کے ساتھ مسلمانوں پر حملہ آور۔

اس تمام صورت حال کو مدّ نظر رکھا جائے تو یقین نہیں آتا ہے کہ اس گھمبیر صورت حال کے باوجود مسلمانوں کو کامیابی و نصرت نصیب ہو گئی ہو۔ معجزہ الٰہی سے ایک رات کے اندر اندر جنگ بدر کی ہیئت بدل گئی۔ مسلمانوں کے ظاہری اسباب میں بھی معجزہ الٰہی سے قدرے بہتری آئی۔ قرآن مجید میں جنگ بدر کے اس الٰہی معجزہ کا تفصیلی ذکر موجود ہے۔ مسلمانوں کو الٰہی تائید و نصرت سے کامیابی نصیب ہوئی۔ لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ الٰہی نصرت اور تائید کے اسباب اور وجوہات کیا تھے۔ اگر رسول اکرم ﷺ کی مکی زندگی کے اس واقعے پر غور کریں تو یہ بات

عیاں ہوتی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی دختر نیک کے ہمراہ جن چھ لوگوں کو بد دعا دی تھی وہ چھ کے چھ لوگ جنگ بدر میں اپنے لشکر کی قیادت (ائمۃ الکفر) کر رہے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے جس انداز میں اپنے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا دفاع کیا ہے یہ جنگ بھی اسی کا ایک عملی نمونہ ہے۔ مورخین نے لکھا ہے ان چھ میں سے پانچ افراد (ائمہ الکفر) جنگ بدر میں واصل جہنم ہوئے ایک شخص عقبہ بن ابی معیط زندہ گرفتار ہوا۔ جنگ بدر سے واپسی پر راستے میں اسے بحکم رسول مقبول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنے انجام کو پہنچایا گیا۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم عام طور پر قیدیوں کے قتل کا حکم صادر نہیں فرماتے۔ جنگ بدر میں ستر سے زیادہ مسلمانوں کے ہاتھوں کفار قیدی بنے تھے ان میں سے صرف دو قیدی نضر بن حارث اور عقبہ ابن ابی معیط کے قتل کا حکم صادر فرمایا۔ یہ دونوں افراد انہی میں سے تھے کہ جب عقبہ بن ابی معیط نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر حالت سجدے میں اوجھڑی ڈالی تو یہ شخص چبوترے میں بیٹھ کر خوشی کا اظہار کر رہا تھا۔ نیز عقبہ بن ابی معیط کو اکسانے میں بھی ان کا ہاتھ تھا۔

ابن کثیر نے اپنی کتاب البدایۃ والنہایۃ میں اس واقعہ کو تفصیل سے لکھا ہے۔ "إِذَا كَانَ رَسُولُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِالصَّفْرَاءِ (2) قُتِلَ النَّضْرُ بْنُ الْحَارِثِ، قَتَلَهُ عَلِيُّ بْنُ أَبِي طَالِبٍ كَمَا أَخْبَرَنِي بَعْضُ أَهْلِ الْعِلْمِ مَنْ أَهْلِ مَكَّةَ، ثُمَّ خَرَجَ حتَّى إِذَا كَانَ بِعِرْقِ الظُّبْيَةِ (3) قَتَلَ عُقْبَةَ بْنَ أَبِي مُعَيْطٍ۔ قَالَ ابْنُ إِسْحَاقَ: فَقَالَ عُقْبَةُ حِينَ أَمَرَ رَسُولُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِقَتْلِهِ: فَمَنْ لِلصِّبْيَةِ يَا مُحَمَّدُ؟ قَالَ " النَّارُ " وَكَانَ الَّذِى قَتَلَهُ عَاصِمُ بْنُ ثَابِتِ بْنِ أَبِي الْأَقْلَحِ أَخُو بَنِى۔ عَمْرِو بْنِ عَوْفٍ كَمَا حَدَّثَنِى أَبُو عُبَيْدَةَ بْنِ مُحَمَّدِ بْنِ عَمَّارِ بْنِ يَاسِرٍ. وَكَذَا قَالَ مُوسَى بْنُ عُقْبَةَ فِي مَغَازِيهِ وَزَعَمَ أَنَّ رَسُولَ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وسلَّم لَمْ يَقْتُلْ مِنَ الْأُسَارَى أَسِيرًا غَيْرَهُ. قَالَ وَلَمَّا أَقْبَلَ إِلَيْهِ عَاصِمُ بْنُ ثَابِتٍ. قَالَ: يَا مَعْشَرَ قريش علام أقتل من بين من ههنا؟ قَالَ عَلَى عَدَاوَتِكَ اللهَ وَرَسُولَهُ. وَقَالَ حَمَّادِ بْنِ سَلَمَةَ عَنْ عَطَاءِ بْنِ السَّائِبِ عَنِ الشَّعْبِيِّ قَالَ: لَمَّا أَمَرَ النَّبِيّ صلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِقَتْلِ عُقْبَةَ قَالَ: أَتَقْتُلُنِى يَا مُحَمَّدُ مِنْ بَيْنِ قُرَيْشٍ؟. قَالَ: " نَعَمْ! أَتَدْرُونَ مَا صَنَعَ هَذَا بِي؟ جَاءَ وَأَنَا سَاجِدٌ خَلْفَ الْمَقَامِ فَوَضَعَ رِجْلَهُ عَلَى عُنُقِي وَغَمَزَهَا فَمَا رَفَعَهَا حَتَّى ظَنَنْتُ أَنَّ عَيْنَيَّ سَتَنْدُرَانِ، وجاء مرة أخرى بسلاً شَاةٍ فَأَلْقَاهُ عَلَى رَأْسِي وَأَنَا سَاجِدٌ فَجَاءَتْ فَاطِمَةُ فَغَسَلَتْهُ عَنْ رَأْسِي"[16]

یہ بات بھی قابل غور ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے تمام قیدیوں کو نہیں صرف ان دو کے قتل کا حکم کیوں صادر فرمایا۔ اس کی بنیادی اور اہم وجہ یہی نظر آتی ہے کہ انہوں نے حضرت فاطمہ زہرا سلام اللہ علیہا کو گھر سے نکلنے اور سر بازار آنے پر مجبور کیا۔ جس کی وجہ سے جناب فاطمہ سلام اللہ علیہا ان پر سخت غضبناک ہوئیں۔ چبوترے میں بیٹھے چھ میں سے پانچ ائمہ کفر کی لاشوں کو جنگ بدر کے روز ایک گندے کنوے میں پھینکنے کا حکم دیا گیا نیز دو قیدی

بنے تھے جن کو راستے میں سزائے موت دی گئی جس کا تذکرہ ہو چکا۔ اس سے صاف واضح ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول عربی ﷺ کو فاطمہ زہرا سلام اللہ علیہا سے اس قدر محبت ہے کہ جن لوگوں نے شہزادی کے بابا کو اذیت پہنچائی اور ان کی توہین سے دوچار ہو کر جناب فاطمہ زہرا سلام اللہ علیہا کو گھر سے باہر نکلنے اور عوام الناس کے مجمع میں آنے پر مجبور کیا اور جناب فاطمہ زہراء سلام اللہ علیہا کی ناراضگی کے موجب بنے تو رب ذوالجلال نے فاطمہ زہراء سلام اللہ علیہا کا پورا پورا بدلہ لیتے ہوان بد بختوں کو جنگ بدر میں ذلت آمیز شکست سے دوچار کیا۔

یاد رہے کہ کفار قریش حضرت ابو طالب کی وفات کے بعد حضرت محمد ﷺ کی توہین میں سینے چوڑے ہو گئے تھے۔ جناب فاطمہ زہراء سلام اللہ علیہا اپنے بابا جان کو دی جانے والی اذیت و توہین سے نہ صرف پریشان رہتی تھی بلکہ آنسو بہاتی رہتی تھی۔ایک موقعہ پر حضرت محمد ﷺ اپنی بیٹی سے کہتے ہیں۔ لا تبکی یا بنیة فان الله مانع ابیك۔[17] یعنی: " میری بچی! رومت! اللہ تعالیٰ تمہارے باپ کی حفاظت کا ذمہ دار ہے۔"

نتیجہ تحقیق: یہ کہ مستند روایات سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ حضرت فاطمہ زہرا بنت رسول اکرم ﷺ کا احترام بنی نوع انسان پر واجب ہے۔ عالم انسانیت کی سعادت دارین حضرت فاطمہ سلام اللہ علیہا کی تعظیم و تکریم میں پوشیدہ ہے۔ حضرت فاطمہ زہرا کی شان میں توہین کرنا در حقیقت، اللہ اور اس کے رسول کی شان میں توہین ہے اور ایسا کرنے والے دنیا و آخرت میں ملعون اور سزا کے مستحق ہیں۔ کیونکہ فاطمہ سلام اللہ علیہا کو اذیت دینا دراصل رسول مقبول ﷺ کو اذیت دینا ہے: "فاطمه بَضْعَةٌ مِنّي، فمن ابغضها فقد ابغضنی۔[18] فاطمہؑ میرا جزء لاینفک ہے جس نے اس کو اذیت دی اس نے مجھے اذیت دی اور جس نے اس کو غضبناک کیا اس نے مجھے غضبناک کیا۔ یہ حدیث الفاظ کے اختلاف کے ساتھ بشمول صحاح ستہ تمام کتب احادیث میں نقل ہوئی ہے۔ جس کے مطابق فاطمہ سلام اللہ علیہا کی رضا اور ناراضگی در حقیقت رسول اکرم ﷺ کی رضا اور ناراضگی ہے۔

* * * * *

حوالہ جات

1۔ حسین، الطباطبائی البروجردی؛ *جامع احادیث الشیعۃ*؛ جلد: 16 (قم، منشورات مدینۃ العلم 1410ھ ق-1368 ش) 192۔

2 ۔ ایضا: 4-193۔

3۔ الشیخ مفید، محمد بن محمد، *مسار الشریعہ فی مختصر تواریخ الشریعۃ*، تحقیق مہدی نجف (بیروت، دار المفید، 1414ھ) 54۔

4۔ جلال الدین، عبد الرحمٰن بن ابی بکر، السیوطی، تاریخ الخلفاء، ج1 (بیروت، مکتبۃ نزار مصطفیٰ الباز، الطبعۃ الأولی، 1425ھ) 61۔
5۔ محمد بن حسن، طوسی، مصباح المتہجد (بیروت، مؤسسہ فقہ الشیعہ، 1411ھ) 793۔
6۔ محمد باقر، المجلسی، بحار الأنوار، ج43 (بیروت –لبنان، دار إحیاء التراث العربی، ندارد) 49۔
7۔ ابو عبد اللہ، محمد بن اسماعیل، البخاری، الجامع الصحیح المختصر، کتاب المناقب، (بیروت، دار ابن کثیر الیمامہ، الطبعہ الثالثۃ، 1407) حدیث نمبر 3624۔
8۔ ابو بکر محمد بن الحسین بن عبد اللہ، البغصدادی، ج5، (الریاض، دار الوطن، الطبعۃ الثانیۃ، 1420ھ) 212۔
9۔ ابو عبد اللہ، محمد بن اسماعیل، البخاری، الجامع الصحیح المختصر، کتاب المناقب، (بیروت، دار ابن کثیر الیمامہ، الطبعہ الثالثۃ، 1407) حدیث نمبر 3767۔
10 صائم، چشتی، البتول (فیصل آباد، چشتی کتب خانہ، فروری 2013) 309۔
11۔ ابو عبد اللہ، محمد بن اسماعیل، بخاری، ج10 (بیروت، دار ابن کثیر الیمامہ، الطبعہ الثالثۃ، 1407) حدیث: 2720۔
12۔ صفی الرحمٰن، مبارک پوری، الرحیق المختوم (لاہور، المکتبۃ السلفیۃ، مئی 2000ء) 551۔
13۔ مبارک پوری، الرحیق المختوم، 561
14۔ ابو عبد اللہ، محمد بن اسماعیل، البخاری، ج10 (بیروت، دار ابن کثیر الیمامہ، الطبعہ الثالثۃ، 1407) 424، حدیث: 2943۔
15۔ ابو عبد اللہ، محمد بن اسماعیل، البخاری، کتاب الوضوء باب اذالقی علی المصلی بیروت، دار ابن کثیر الیمامہ، الطبعہ الثالثۃ، 1407) ندارد۔
16۔ إبو الفداء إسماعیل بن عمر، ابن کثیر، البدایۃ والنہایۃ، ج3 (بیروت، دار إحیاء التراث العربی، الطبعۃ: الأولی 1408ھ) 372۔
17۔ محمد حسین ھیکل، حیات محمدؐ، مترجم حیدر علی (کراچی، مولجی لطہ عالمگیر روڈ، شرف آباد، ندارد) 220۔
18۔ احمد بن شعیب الخراسانی، النسائی، حققہ اِحادیثہ: حسن عبد المنعم شلبی، ج7 (بیروت، مؤسسۃ الرسالۃ، الطبعۃ الأولی، 1421ھ) 394، حدیث: 8313۔

کتابیات

1) البخاری، ابو عبد اللہ، محمد بن اسماعیل، الجامع الصحیح المختصر، بیروت، دار ابن کثیر الیمامہ، الطبعہ الثالثۃ، 1407۔
2) ابن کثیر، إبو الفداء إسماعیل بن عمر، البدایۃ والنہایۃ، بیروت، دار إحیاء التراث العربی، الطبعۃ: الأولی 1408ھ۔
3) البغصدادی، ابو بکر محمد بن الحسین بن عبد اللہ، الریاض، دار الوطن، الطبعۃ الثانیۃ، 1420ھ۔
4) السیوطی، عبد الرحمٰن بن ابی بکر، جلال الدین، تاریخ الخلفاء، بیروت، مکتبۃ نزار مصطفیٰ الباز، الطبعۃ الأولی: 1425ھ۔
5) المجلسی، محمد باقر، بحار الأنوار، بیروت، دار إحیاء التراث العربی، ندارد۔

6) النسائی، اِحمد بن شعیب الخراسانی، حققہ اِحادیثہ: حسن عبد المنعم شلبی، بیروت: مؤسسۃ الرسالۃ، الطبعۃ الاولی، 1421ھ۔
7) البکری، محمد علی بن محمد، دلیل الفالحین لطرق ریاض الصالحین، بیروت: دار المعرفۃ للطباعۃ والنشر والتوزیع، الطبعۃ: الرابعۃ، 1425ھ 2004م۔
8) صائم چشتی، البتول، فیصل آباد: چشتی کتب خانہ، فروری 2013۔
9) طوسی، محمد بن حسن، مصباح المتہجد، بیروت، مؤسسہ فقہ الشیعہ، 1411ھ۔
10) مفید، محمد بن محمد، مسارالشریعہ فی مختصر تواریخ الشریعۃ، تحقیق مہدی نجف، بیروت، دارالمفید، 1414ھ۔
11) مبارک پوری، صفی الرحمٰن، الرحیق المختوم، لاہور: المکتبۃ السلفیۃ، مئی 2000ء۔
12) محمد حسین ھیکل، حیات محمد، مترجم حیدر علی، کراچی: مولجی لطا عالمگیر روڑ، شرف آباد، ندارد۔

اقوام متحدہ کا 2030 ترقیاتی ایجنڈا؛ ایک تنقیدی جائزہ

A CRITICAL ANALYSIS OF UN 2020

(SUSTAINABLE DEVELOPMENT AGENDA)

Hashim Raza Abidi

Abstract:

Looking at the historical and political background, policies and objectives of UNESCO's 2030 agenda and intense criticism by world leaders, academic, political, social, economic experts and UN designates themselves illustrates that these policies and agenda is no way in the interest of our national security, culture and social fabric. According to this article, this agenda will have an incredibly negative impact upon our sovereignty and national & Islamic cultural identity. It will turn out to be a political and cultural suicide or equates giving oneself into socio-economic slavery of others.

Keywords: *civilization, unesco2030, softpower, education, national security.*

خلاصہ

یونیسکو 2030 ایجنڈا کے تاریخی وسیاسی پس منظر، اس کی پالیسیوں، ایجنڈا کے مقاصد اور اس پر مختلف ممالک کے سربراہان، تعلیمی، سیاسی، معاشی اور سماجی ماہرین اور خود اقوام متحدہ کے مختلف شعبہ جات کے ذمہ داران کی طرف سے اٹھائے جانے والے سنگین اعتراضات اور خدشات کا تفصیلی جائزہ لینے کے بعد یہ بات سامنے آتی ہے کہ ان پالیسیوں کا اجرا کسی بھی طرح سے ہماری ملکی سالمیت، ہماری تہذیب اور سماجی نظام کے حق میں نہیں ہے۔ اس کے ہماری سالمیت اور قومی واسلامی تہذیبی تشخص پر انتہائی منفی اثرات مرتب ہوں گے۔ بلکہ اس کا اجرا سیاسی اور تہذیبی خودکشی یا اپنے آپ کو دوسروں کی سماجی و معاشی غلامی میں دینے کے برابر ہے۔

کلیدی کلمات: تہذیب، یونیسکو 2030، سافٹ پاور، تعلیم، قومی سالمیت۔

تعارف

دنیا میں ایک پائیدار تبدیلی کے نام پر بنائی جانے والی اس پالیسی اور اس کے اصل مقاصد کو سمجھنے کے لئے ضروری ہے کہ ہم اس پالیسی کے اعلان سے پہلے دنیا کے حالات کو سمجھیں اور دیکھیں کہ دنیا میں ایسی کون سی تبدیلیاں رونما ہوئی ہیں جن کی وجہ سے اس پالیسی کی ضرورت پیش آئی؟ دوسرے لفظوں میں عالمی سطح پر کون سا ایسا سماجی و سیاسی خلا وجود میں آیا جسے پر کرنے کے لئے ایک نئے عالمی نظام کی ضرورت محسوس کی گئی؟ مختلف شعبہ حیات سے تعلق رکھنے والے ماہرین اور اس 2030 کا تنقیدی جائزہ لینے والے تمام شخصیات اور صاحب رائے افراد کی یہ متفقہ نظر ہے کہ: اس پالیسی کا مقصد دنیا بھر میں ایک خاص قسم کی تبدیلی لانا ہے یا یوں کہا جائے کہ دنیا کے ممالک اور قوموں کو ایک نئی عالمی لبرل حکومت کے لئے تیار کرنا ہے اور نئی نسلوں کو ایک مغرب کی لبرل، ضد انسانی و اخلاق کے منافی اقداروں پر استوار کرنا، نئے عالمی سماجی، معاشی وسیاسی نظام کے لئے ذہنی اور فکری طور پر آمادہ کرنا ہے۔

اس نئی عالمی حکومت یا نیو ورلڈ آرڈر کا خدوخال کیا ہوگا؟ اس کا سیاسی اور سماجی نظام کیا ہوگا؟ ان پالیسیوں کے نتیجے میں آنے والی تبدیلیوں کے فوائد کن نادیدہ و دیدہ طاقتوں کو حاصل ہوں گے اور اس کے نقصانات دیگر تہذیبوں اور سیاسی نظاموں پر کس شکل میں ظاہر ہوں گے؟ اس کو سمجھنا ضروری ہے۔ پھر یہ کہ اس پالیسی کا نفاذ اور اجراء ہماری قومی سالمیت اور سماجی نظاموں کی ترقی و بہبود کا سبب بنے گی یا نہ ان کو اور مزید ضعیف کریں گی؟ ان تمام سوالات کے جوابات کو سمجھنے کے لئے ضروری ہے کہ چند اہم مسائل اور موضوعات کا علمی جائزہ لیا جائے۔ ایک، یہ کہ سماجی نظام اور اس میں تعلیم کا مقام و کردار ہے کیا ہے۔ اور دوسرا، یہ کہ ۱۹۹۰ کے بعد دنیا میں پیدا ہونے والا سیاسی خلا ہے اور اس کو پُر کرنے کے لئے پیش کیے گئے تہذیبوں کے ٹکراو "کلیش آف سویلائزیشن" جیسے نظریات کا صحیح ادارک کیا ہے؟ تیسرا، یہ کہ "سافٹ پاور اور اس کے ہتھیار کیا ہیں؟ چوتھا، یہ کہ عالمی طاقتوں کے سیاسی و معاشی ایجنڈے اور 2030 کا باہمی تعلق کیا ہے؟ پانچواں، یہ کہ 2030 کے مقاصد، ان میں موجود ابہامات، اس پر اٹھائے جانے والے اعتراضات اور معترضین کے دلائل کیا ہیں؟

1۔ سماجی نظام میں تعلیم کا مقام و کردار

قومیں تہذیب کے دامن میں پرورش پاتی ہیں تہذیب ہی کے سائے میں زندہ رہتی ہیں اور اسی تہذیب کی بدولت اقوام عالم میں پہچانی جاتی ہیں۔ اور جب کسی قوم کی تہذیب مٹ جائے یا اسے مٹا دیا جائے تو وہ قومیں خود بخود ہلاک ہو جاتی ہیں چاہے اس کے افراد زندہ و تعداد میں کتنے زیادہ ہی کیوں نا ہوں۔ ان کی زمانے میں کوئی شناخت نہیں ہوتی اور نہ ہی اقوام عالم میں ان کا کوئی ذکر ہوتا ہے بلکہ اس متروک یا مغلوب تہذیب کے لوگ نئی

تہذیب کا حصہ بن جاتے ہیں۔ اگر کوئی تہذیب مضبوط ہو تو قوم کو زمین سے آسمان کی بلندیوں پر لے جاتی ہے۔ اور صدیوں کے بعد بھی بابل، موئن جو داڑو، یونان و مصر جیسی تہذیبی آثار ناپید قوموں کی عظمت کی گواہی دے رہی ہوتی ہیں۔ سومائل نے تہذیب کی تعریف کچھ اس طرح کی ہے "تہذیب ایک ثقافتی وجود ہے۔ دیہات، خطے، نسلی گروہ، قومیتیں، مذہبی گروہ، سبھی ثقافتی فرق کی مختلف سطحوں پر الگ الگ ثقافت رکھتے ہیں۔ 1 یہ وہ اجزاء ہیں جن سے مل کر ایک تہذیب وجود میں آتی ہے۔ ان عناصر کی ہماری اسلامی تہذیب میں ترکیب باالفاظ دیگر ہمارے سوشل سسٹم کی کیمسٹری کا صحیح ادارک انتہائی ضروری ہے۔ کیونکہ اس ترکیبی وجود کے عناصر کی شناخت کے بعد ہمارے لئے اس کی حفاظت آسان ہو جائے گی۔ ہم اس کو نقصان پہچانے والے داخلی مسائل یا بیرونی سازشوں یا عالمی حالات و سیاسی بیانیوں میں تبدیلی کے نتیجے میں ہماری سالمیت کو درپیش مسائل کو بہتر طور پر سمجھنے اور ان کے مناسب حل نکالنے میں مددگار ہوگی۔

جیسے کی ہم پہلے بھی اشارہ کر چکے ہماری اسلامی تہذیب میں سب سے اہم عنصر مذہب کا ہے۔ اسلام ایک کامل ضابطہ حیات ہے۔اس کا اپنا عالمی تصور یا ورلڈ ویو ہے۔ جس کی رو سے زمین کا اصل حاکم اللہ تعالی ہے۔ جس نے انسان کو روئے زمین پر اپنا خلیفہ معین کیا۔اور اس کی ہدایت کے لئے انبیاءاور ان کے ساتھ انسانوں کی ہدایت، معاشروں میں عدل وانصاف کی برقراری کے لئے کتاب نازل کی جس میں ایک کامل سماجی نظام کے لئے ضروری حکومتی، معاشی، معاشرتی اور اخلاقی قوانین کو بیان فرمایا[2] اور ان کی تکمیل و تفسیر کے لئے سنت و عقل کو بھی حجت قرار دیا۔ تہذیب جتنی اعلیٰ اخلاقیات اور فطرت کے ساتھ سازگار ہو اتنا ہی اس قوم کا وقار بلند ہوتا ہے پیغمبر اسلام ﷺ کے مبعوث ہونے سے پہلے عرب بادیانشین غیر مہذب قوموں میں شمار کیے جاتے تھے ان کے پاس ناہی حکومتی نظام تھا، ناں ہی معاشرتی نظم کو برقرار رکھنے والے قوانین اور ناہی اعلیٰ اخلاقی اقدار یں جیسے کہ امام علی علیہ السلام نے لوگوں کو اسلام کی عظمت سمجھانے کے لئے ان کی بعثت رسول سے پہلے کی حالت زار کو یاد دلاتے ہوئے فرمایا" بعثت اس وقت ہوئی ہے جب لوگ ایسے فتنوں میں مبتلا تھے جن سے ریسمان دین ٹوٹ چکی تھی۔ یقین کے ستون ہل گئے تھے۔ اصول میں شدید اختلاف تھا اور امور میں سخت انتشار۔ مشکلات سے نکلنے کے راستے تنگ وتاریک ہو گئے تھے۔ ہدایت گمنام تھی اور گمراہی برسرعام۔، رحمان کی معصیت ہو رہی تھی اور شیطان کی نصرت" ایمان یکسر نظر انداز ہو گیا تھا" اس کے ستون گر گئے تھے اور آثار ناقابل شناخت ہو گئے تھے" راستے مٹ گئے تھے اور شاہراہیں بے نشان ہو گئی تھیں۔ لوگ شیطان کی اطاعت میں اس کے راستے پر چل رہے تھے۔ یہ لوگ ایسے فتنوں میں مبتلا تھے جنہوں نے انہیں پیروں تلے روند دیا تھا اور سموں سے کچل دیا تھا اور خود اپنے پنجوں کے بل کھڑے ہو گئے تھے۔ یہ لوگ

فتنوں میں حیران و سر گرداں اور جاہل و فریب خوردہ تھے۔ پروردگار نے انہیں اس گھر (مکہ) میں بھیجا جو بہترین مکان تھا لیکن بدترین ہمسائے۔ جن کی نیند بیداری تھی اور جن کا سرمہ آنسو۔ وہ سرزمین جہاں عالم کو لگام لگی ہوئی تھی اور جاہل محترم تھا"[3] لیکن اسلام نے آکر ان کو دنیا کی بہترین قوم بنادیا جو دوسری قوموں کے لئے بھی نمونہ قرار پائی جس کو قرآن نے یوں فرمایا "كُنتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ" (110:3)۔

اسلام نے جس چیز سے اس غیر مہذب قوم کو مہذب ترین قوم میں بدل دیا وہ اس کا اعلیٰ فطریات اور عقلیات سے ہم آہنگ سماجی نظام تھا جس میں ایک جدید اور باکمال عالمی تہذیب کے تمام عائلی، سماجی، معاشی، سیاسی اور اخلاقی اصول موجود تھے۔ یہ اسلامی تہذیب جہاں بھی گئی اس نے اس قوم کو شناخت بھی دی، عزت و سروری بھی، برصغیر میں مسلمانوں کی ہزار سالہ اسلامی حکومت اسی تہذیب کا نتیجہ تھی، اسی تہذیب کی بدولت دو قومی نظریے نے جنم لیا جس نے برطانوی استعمار کے پنجوں میں جکڑی ہوئی قوم کو آزادی دلوائی، اس لئے پاکستان کے خمیر میں اسلامی تہذیب ملی ہوئی ہے۔ پاکستانیت کا وجود اسلامیت کے بغیر ادھورا بلکہ بے معنی ہے۔ پاکستان کی بقاء و ترقی کا حل بھی اسی تہذیب سے وابستہ ہے۔ اسلامی تہذیب کے خلاف ہر قسم کی سازش در واقع پاکستان کی سالمیت کے خلاف سازش ہے۔

تعلیمی نظام ہر تہذیب کا تولیدی عضو ہوتا ہے۔ تعلیم میں رسمی تعلیم اور علم، مہارت، اور رویوں کی غیر رسمی ترسیل دونوں شامل ہیں۔[4] قومی کاروان میں پرانے افراد بوڑھے ہو جاتے ہیں اور مر جاتے ہیں، اور ایک نئی نسل ان کی جگہ لے لیتی ہے۔ لیکن اس قوم کی ثقافت ایک زندہ وجود ہے جو اس قومی پیکر میں خون کی مانند جاری و ساری رہتی ہے۔ اس قومی ثقافت کی عمر افراد کی عمر سے بہت زیادہ طولانی ہوتی ہے کیونکہ یہ کئی نسلوں اور کئی صدیوں پر محیط ہوتی ہے اور اس کی طولانی عمر کا راز تعلیمی نظام میں ہے۔ یہی تعلیمی نظام ہے جو ایک نسل کے لوگوں کی راہ و رسم اور علم کو بعد کی نسلوں تک منتقل کرتا ہے۔ انسانی ترقی اور معاشرتی تبدیلیوں کے ساتھ ساتھ ثقافت میں ردوبدل کا عمل جاری رہتا ہے، لیکن اس کے بنیادی اجزاء جیسے قومی اعتقادات و نظریات، مذہبی و سماجی مراسم، اخلاقی بنیادی اقدار اور طرز عمل کے نمونوں کا ایک قابل تسلسل عمل ہوتا ہے جو اسے دوسری ثقافتوں سے ممتاز کرتا ہے۔ جو چیز اس قومی و تہذیبی تسلسل یقینی بناتی ہے وہ اس کا اپنا تعلیمی نظام ہے جس کی تشکیل میں معاشی ضروریات کے ساتھ ساتھ تہذیبی امور کو ترجیحی بنیادوں پر فراہم کرتا ہے۔

اسی لیے تعلیمی ماہرین اس بات کہ معترف ہے کہ "یہ معاشرتی تبدیلی اور سماجی کنٹرول کا ایک طاقتور ذریعہ ہے"[5] اور اسی تعلیمی نظام کے ذریعے ایک قوم کی تہذیب کو بدل کر اسے اپنا تابع بنایا جاسکتا ہے۔ اس کی خودی کو بے خودی

میں، طرز زندگی کو دوسروں کی تقلید، فیصلوں کو دوسروں کی مرضی میں ڈھالا جاسکتا ہے۔ یہی تعلیمی نظام کی خاصیت ہے۔ بقول و بر مارکس کے تعلیمی ادارے انسان ساز فیکٹریاں ہیں۔ ان میں اپنے مزاج و فکر کے انسان بنائے جاتے ہیں۔ اگر تعلیمی نصاب اپنی ثقافت کو چھوڑ کر دوسری تہذیب و ثقافت کی ترویج کرنے لگے تو اس ملک کی اپنی تہذیب نابود ہو جاتی ہیں، جو جو اسکول سسٹم اور تعلیمی نصاب میں اختلاف اور ڈائیورسٹی بڑھتی جاتی ہے معاشرے میں لوگوں کے درمیان فکری اختلاف بڑھتا جاتا ہے اور قوم معاشرتی اعتبار سے طبقات اور سیاسی افکار کے لحاظ سے گروہوں اور جماعتوں میں بٹتے جاتے ہیں۔ جس کے نتیجے میں لوگوں کے درمیان موجود ایک قوم اور ایک تہذیب کا تصور جو کسی قوم کے اتحاد کی بنیادی شرط ہوتی ہے آہستہ آہستہ ختم ہوتا چلا جاتا ہے۔ ہر طبقہ اور جماعت اپنے طرز تفکر سے لائف اسٹائل اپناتا ہے اور اسی انداز سے معاشرے و ملک کے نظام کو چلانا چاہتا ہے۔ اس طرح ملک کے اندر ہمیشہ کے لئے ناختم ہونے والا فکری اور تہذیبی تنازع کھڑا ہو جاتا ہے۔ قرآن نے ہمیں اسی چیز سے ہوشیار کیا ہے کہ مختلف افکار اور تہذیبوں کے پیچھے مت چلو متفرق ہو جاؤ گے ایک دوسرے سے جدا ہو جاؤ گے۔ "وَلاَ تَتَّبِعُواْ السُّبُلَ فَتَفَرَّقَ" (153:6)۔ ہر شخص و گروہ اپنے مفادات کی فکر میں لگ جاتا ہے وطن سے محبت اور قوم کی خدمت کا جذبہ ٹھنڈا پڑ جاتا ہے۔ ایسی صورتحال میں ملک دشمن طاقتیں باآسانی سیاست دانوں، بانفوذ شخصیات اور اداروں میں مختلف بہانوں جیسے کبھی سیاسی حمایت، تو کبھی مالی اور علمی و صنعتی ترقی میں مدد سے نفوذ پیدا کر لیتی ہیں اور ان کے ذریعے اپنے مفادات حاصل کرتی ہیں۔ اور اگر ضرورت پڑے تو ان ہی کے ذریعے ملک میں سیاسی بحران اور دہشتگردی کے ذریعے ملک میں حرج و مرج پیدا کر دیتی ہیں۔

مغرب کو اس کا بخوبی ادارک بھی ہے اور تجربہ بھی۔ جمیلہ علم الہدی[6] جو بہشتی یونیورسٹی کی استاد اور تعلیم و تربیت کے موضوع پر کئی علمی کتابوں اور مقالات کی مصنفہ بھی ہیں، تعلیمی نصاب پر برگزار ہونے والی ورکشاپ میں اپنی گفتگوں میں فرماتی ہیں "کلونیزم کی تاریخ کے مطالعہ سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ۔ سامراجی اور استعماری حکومتیں کسی بھی ملک پر اپنا کنڑول جمانے کے بعد سب سے پہلے ایسے مفت یا سستی تعلیم کا بندوبست کرتے تھے جو ان کی تہذیب کی عکاسی کرتا انہی کی زبان میں بنا ہوتا تھا۔ اس لئے جن جن ایشیائی، عرب، افریقی اور جنوبی امریکا کے ممالک میں برطانوی، فرانسیسی اور اٹالین استعماری حکومتوں نے اپنی کالونیاں بنائیں وہاں سب سے پہلے اپنی زبان میں تعلیمی نظام کو عام کیا۔ اس لئے۔ اور آج بھی ان ممالک کے لوگ اپنی قومی زبان کے ساتھ ساتھ استعمار کی زبان بولتے ہیں اور ان کے پولیٹکل، سوشل سسٹم انہی استعماری اصولوں پر چل رہا ہے۔ ان کے لائف اسٹائل پر مغربی کلچر کے آثار نمایاں ہیں۔"

2۔ پوسٹ کولڈ وار ارا (Post-cold war era)

90ء کی دہائی میں سوویت یونین کی تحلیل اور سرد جنگ کے خاتمے سے دنیا میں ایک نیا سیاسی خلا پیدا ہوا جس نے غربی بالخصوص امریکی مفکرین کو یہ سوچنے پر مجبور کیا کہ اب دنیا کا نیا عالمی نظام کیسا ہونا چاہیے۔ پرانے عالمی بیانیے اب ناکارہ ہیں کیونکہ سوویت یونین ختم ہو چکا ہے اور دنیا کو ایک نئے یونی پولر نظام کی ضرورت ہے۔ اس عالمی صورت کو مختلف عالمی سیاسی و سماجی ماہرین نے اپنی تصانیف اور تحقیقات میں منعکس کیا ہے۔ سیمیول ہنٹنگٹن کے بقول "عالمی سیاست ایک نئے مرحلے میں داخل ہو رہی ہے، اور دانشوروں نے "آخر یہ کیا ہوگا؟" اس کے نظریہ کو پھیلانے میں ہچکچاہٹ محسوس نہیں کی"[7] اس بارے میں آرفرڈ کچھ اس طرح اظہار خیال کرتے ہیں "ان حالات سے لگتا ہے کہ اب دنیا ایک نئے بین الاقوامی قانون (سوشل سسٹم) کے لیے آمادہ ہے ایک ایسا قانون جو سرد جنگ کے زمانے میں بنائے گئے قوانین سے مختلف ہو۔ جوناڈیوڈسن اس بارے میں اپنے مقالے میں فرماتی ہیں: کالڈور (1999) اور فوکیویاما (2004) جیسے اسکالرز یہ سمجھتے ہیں کہ سوویت یونین کے خاتمے کے عالمی مسائل پر گہرے اثرات پڑے ہیں، جن میں نئے تنازعات اور سیکیورٹی کے مسائل شامل ہیں۔[8]

یہ نیا نظام کیسا ہونا چاہیے؟ اس حوالے سے مفکرین نے مختلف نظریات پیش کئے جن میں سے ایک فوکو یاما ہیں جنہوں نے اینڈ آف ہسٹری کا نظریہ پیش کیا ہے اس نظریے میں "انہوں نے لبرل جمہوریت کی حتمی فتح کا اعلان کیا اور استدلال کیا کہ "یہ بنی نوع انسان کے نظریاتی ارتقاء اور انسانی حکومت کی آخری شکل کا حتمی نقطہ بن سکتا ہے اور اس طرح تاریخ کا خاتمہ ہو سکتا ہے۔" اپنے مضمون میں، انہوں نے یہ کہتے ہوئے لبرل ازم کی فتح کا جشن منایا کہ دوسرے تمام آئیڈیولوجیز پر، لبرل ریاستیں داخلی طور پر زیادہ مستحکم اور بین الاقوامی تعلقات میں زیادہ پرامن ہیں۔"[9] ان کا مدعی یہ ہے کہ دنیا میں اس وقت صرف ایک ہی انسانی نظام باقی ہے جس کے مطابق دنیا کو چلایا جا سکتا ہے اور یہ نظام لبرل ڈیموکریسی ہے یعنی ویسٹرن لبرل ڈیموکریسی۔ مغربی تہذیب میں جدید دور کے تمام تقاضوں کو پورا کرنے کی صلاحیت ہے اور یہ بہترین سماجی وحکومتی نظام ہے جو دنیا کو ترقی دے سکتا ہے اور امنیت کا ضامن بن سکتا ہے لہٰذا دنیا کی باقی قوموں کو لبرل ڈیموکریسی قبول کرنی چاہیے اور ویسٹرن تہذیب اپنا لینی چاہیے۔

واضح سی بات ہے اس نظریے کا ایک ہی مقصد تھا کہ دنیا میں امریکی اجارہ داری کو مضبوط کیا جائے حقیقت میں یہ پرانے کولونائزیشن کی ایک نئی عالمی اور گلوبلائز صورت ہے جو موجودہ حالات اور مسائل کی وجہ سے سامنے آئی ہے لیکن جلد ہی خود امریکی مفکرین کو اس بات کا احساس ہو گیا کہ نظریہ اتنا جاندار نہیں بقول سیلسن اونر کے "he states his arguments without a strong basis and with a lack of evidence." کیونکہ[10]

دنیا میں بہت سی تہذیبی اور سیاسی نظام موجود ہیں جو کبھی بھی اس سیاسی نظام اور نئی عالمی تہذیب کو قبول نہیں کریں گے جیسے اسلام کی اپنی 14 سو سالہ شاندار تہذیب اور سیاسی نظریہ ہے چائنا کا اپنا کلچر اور سیاسی نظام ہے، عرب ممالک میں ابھی تک موروثی بادشاہی نظام چل رہا ہے یہ تمام سیاسی نظام نظریاتی طور پر مغربی لبرل ڈیموکریسی کے ساتھ نہ صرف تضاد رکھتے ہیں بلکہ ان ملکوں کی تہذیبیں بھی مغربی تہذیب سے مختلف ہیں اور مغرب میں رائج بہت سیاسی، سماجی اور اخلاقی اقداریں این تہذیبوں میں ضد اقدار سمجھی جاتی ہیں۔ لہٰذا اس تہذیبی تضاد کی موجودگی میں ایک عالمی سیاسی، سماجی اور ثقافتی نظام کا قیام ناممکن ہے۔

3۔ تہذیبی ٹکراو (Clash of Civilizations)

سیمیول بھی فوکویاما کی طرح دنیا پر امریکی عالمی حکومت کی آرزو رکھتے ہیں، لیکن وہ اس بات کی طرف متوجہ تھے کہ دنیا میں مغربی تہذیب کے علاوہ اور بھی تہذیبیں ہیں۔ جن میں ایک عالمی حکومت کی تمام تر خصوصیات موجود ہیں یا ان کے ہوتے ہوئے مغربی اقداروں پر بنے ہوئے ایک عالمی سماجی نظام کا امکان نہیں اور ان کی موجودگی میں امریکا کا عالمی حکومت کا دیرینہ خواب شرمندہ تعبیر نا ہوگا۔ لہٰذا انہوں نے واضح طور پر یہ اعلان کیا کہ آیندہ کی جنگ معاشی یا سیاسی نظاموں کے لئے نہیں ہوگی بلکے تہذیبوں کے درمیان ہوگی۔ یہ میرا قیاس ہے کہ اس نئی دنیا میں تنازعات کا بنیادی ماخذ سیاسی بیانیہ یا معاشی نظریہ نہیں ہوگا۔ سیمیول ہنٹنگٹن نے کیونکہ سیاسی نظریات اور معاشی تنازع کے مقابلے تہذیبی تنازع کو اہمیت دی؟ اس کی وجہ واضح ہے۔ انسانی سماج میں رائج سماجی و اخلاقی اقداریں، انسٹی ٹیوشنز یا اداروں کے مقاصد، قوانین، دوسرے اقوام سے تعلقات کی نوعیت اور ترجیحات کو تہذیب تعین کرتی ہے۔ ہم پہلے بیان کر چکے ہیں کہ قومیں تہذیب کے دامن پر ورش پاتی ہیں تہذیب ہی کے سائے میں زندہ رہتی ہیں اور اسی تہذیب کی بدولت اقوام عالم میں پہچانی جاتی ہیں۔ اور جب کسی قوم کی تہذیب مٹ جائے یا اسے مٹا دیا جائے تو وہ قومی خود بخود ہلاک ہو جاتی ہیں چاہے اس کے افراد زندہ و تعداد میں کتنے زیادہ ہی کیوں نا ہوں۔ ان کی زمانے میں کوئی شناخت نہیں ہوتی اور نہ ہی اقوام عالم میں ان کا کوئی ذکر ہوتا ہے بلکہ اس متروک یا مغلوب تہذیب کے لوگ نئی تہذیب کا حصہ بن جاتے ہیں۔

سیمیول نے اس نظریہ کے ذریعے عالمی حکومت کا منصوبہ رکھنے والی طاقتوں کو ان کی راہ میں موجود اصل رکاوٹوں کی طرف متوجہ کرنے کے ساتھ ساتھ ان رکاوٹوں کے مصداق کو بھی بیان کیا ہے۔ تاکہ ان حریف طاقتوں کو بھی پہچان لے۔ اس لیے وہ اس پالیسی ساز آرٹیکل میں آگے چل کر بغیر کسی جھجک کہ اسلام اور چائینز تہذیبوں کو مغربی تہذیب کا سب بڑا دشمن قرار دیتے ہوئے ان کی آئندہ عالمی پالیسیوں کی سمت و سو کا بھی تعین کرتے ہیں۔[11] اس بات سے یہ نتیجہ نکالا جاسکتا ہے کہ اسلامی تہذیب کے ہوتے ہوئے کبھی بھی مغربی لبرل تہذیب کو

عالمی تہذیب کے طور پر عالم اسلام پر مسلط نہیں کیا جاسکتا۔ اس لیے ایک ایسی عالمی پالیسی کی ضرورت ہے جس کے ذریعے دنیا میں مغربی لبرل تہذیب کے رواج کے لئے راہ ہموار کی جائے۔ ان تمام مفروضات اور ان کے محکم دلائل کو سامنے رکھتے ہوئے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ۔ 2030 در واقع اس قسم کی عالمی حکومت بنانے کا ایک منظّم ایجنڈا ہے۔ جس کے انسانی معاشروں، ان کے سیاسی، سماجی، معاشی، عائلی نظاموں اور ان کی دینی، سماجی اور اخلاقی اقداروں پر بہت گہرے منفی اثرات ہوں گے۔ جس کو کو مختلف مکاتب، نظاموں کی پیروی کرنے والے ناقدین کے اس پالیسی پر تنقیدیں جائزوں، شدید رد عمل اور اس دستاویز پر اٹھائے جانے والے اہم علمی و فکری سوالات سے باآسانی سمجھا جاسکتا ہے۔ لہٰذا ان کی روشنی میں اس پالیسی کا سنجیدگی جائزہ لینا ہمیں ایک ایسی غلط حکمت عملی سے بچاسکتا ہے جس کے اثرات ہماری تہذیب، ریاست اور ہماری آنے والی نسلوں کو کسی بڑے شناختی اور حیثیت بحران میں دھکیل سکتا ہے۔

4۔عالمی طاقتوں کے سیاسی و معاشی ایجنڈے اور 2030 کا باہمی تعلق

انسان غریزی طور پر ہر چیز کو اپنی بقاء اور ارتقاء کے لئے استعمال کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ یہی غریزی جذبہ ہی اس کو زندہ رکھے ہوئے ہے۔ اسی جذبہ کی وجہ سے اپنے آغاز زندگی سے انسان درختوں و حیوانوں کو اپنی خوراک کے لئے استعمال کرنے لگا، انہی کی مدد سے اپنے لیے گرمی و سردی سے بچاو کے لئے لباس اور بارش پانی اور درندوں کے حملوں سے بچنے کے لئے کبھی زمین اور کبھی غاروں میں آشیانے بنائے۔ اپنے جنسی سکون کے لئے اپنے ہی ہم ذات سے مل کر (جس میں خداوند نے اس کے لئے کشش بھی رکھی اور اس کی نئی نسل کی تولید و پرورش کی صلاحیت بھی) خاندان کو تشکیل دیا۔[12] اس طرح خاندان اور قبائل وجود میں آئے۔ وقت کے گزرنے کے ساتھ انسانی آبادی میں اضافہ ہوتا رہا اور اس میں موجود سیکھنے اور سمجھنے کی خداداد صلاحیتوں کی وجہ سے انسان کے علم و تجربات میں بھی بڑھتا گیا۔ جس کی بدولت انسان میں موجود دوسروں کو تسخیر کی قابلیت بھی بڑھتی گئی۔ جوں جوں ان تسخیری وسائل میں اضافہ ہوتا گیا دوسروں کو اپنی خدمت کے لئے استعمال کرنے کے اس غریزی جذبہ میں بھی شدت آتی گئی۔ خاندان سے قبیلے، قبیلوں سے قومیں وجود میں آئیں اور ہر مرحلہ میں جو انسان افرادی، وسائل اور علم و تجربہ کے اعتبار سے قوی تھے انہوں نے ضعیفوں کو اپنی ماتحتی میں لینا شروع کردیا۔ کیونکہ یہ جذبہ ہر انسان میں تھا، اس لیے ان میں نا ختم ہونے والا اختلافات اور لڑائیوں کا سلسلہ شروع ہوگیا۔

لہٰذا عدل و انصاف کے ساتھ ہر انسان کے حقوق کی فراہمی اور صلح و امنیت کی برقراری کے لئے قوانین کی ضرورت محسوس کی گئی۔ انسان نے بھی قوانین بنائے اور اسے پہلے خالق انسان (جس کو اپنی مخلوخات کی تمام صفاتوں کا بھی پتا تھا اور اس کی ایک سعادت مند زندگی ضروریات کا بھی) نے تمام اعلی انسانی صفات کے حامل انسانوں کو بہ عنوان

پیامبر بنا کر بھیجا اور ان کے ساتھ انسانی سماج کے لئے قوانین بھی۔[13] انسان کے بنائے ہوئے قوانین اس کی کم علمی اور خود غرضی اور نسلی و قومی تعصب کی وجہ سے انسانی معاشروں عدل وانصاف فراہم کرنے سے عاجز رہے ہیں۔ اور جب بھی انسانوں نے، انسانی نظاموں کو الٰہی نظاموں پر ترجیح دی، فرعونی، استبدادی اور استعماری جیسے ظالم نظام وجود میں آئے جن کا صرف ایک ہی مقصد تھا وہ دوسروں کو اپنی غلامی میں لے کر ان سے خدمت لینا۔

عصر حاضر میں علوم کی ترقی، پیشرفتہ وسائل کی ایجاد اور عالمی اداروں کی تاسیس نے جہاں انسانیت کی خدمت اور قوموں کے باہمی اختلافات کو حل کرنے کے موقع فراہم کیے، وہاں ہمیشہ کی طرح اسی غریزے کی وجہ سیاسی، معاشی اور ٹیکنالوجی کی قدرت رکھنے والے ملکوں اور ملٹائی نیشنل کمپنیوں کو یہ موقع دیا کیا کہ وہ دوسری ضعیف ملتوں کو تسخیر کرکے اپنی عزائم کے لئے استعمال کرے۔ لہٰذا انہیں اپنے معاشی وسیاسی عزائم کی تکمیل کے لئے ایک ایسے عالمی قوانین کی ضرورت تھی جس کے ذریعے قوموں کو ایک پائیدار فکری، سماجی، معاشی تبدیلی کے ذریعے اپنا تابع بنایا جاسکے۔ 2030 کے مقاصد، اس کے مختلف شعبہ حیات کے لئے بنائے جانے والے قوانین کی ماہیت اور اس پر ناقدین کے دلائل۔ جن کو ہم آگے چل کر بیان کریں گے۔ سب کے سب اس نظریہ کی تصدیق کرتے ہیں۔

5۔ سوفٹ پاور اور اس کے ہتھیار

صحیح سیاسی حکمت عملی کا تقاضا یہ ہے کہ بین الاقوامی سطح پر ابھرنے والے نئے بیانیوں اور عالمی اداروں کی جانب سے سیاسی، سماجی، حقوق بشر اور تعلیمی شعبوں میں نئی پالیسیوں کو دنیا میں رونما ہونے والی سیاسی، معاشی تبدیلیوں کے تناظر میں دیکھا جائے اور کسی بھی پالیسی کو اجراء کرنے سے پہلے بیان شدہ وسیع تناظر میں، اس کے ملکی سالمیت، سماجی و معاشی نظام پر پڑھنے والے اثرات کا اندازہ لگایا جائے۔ اور یہ اطمینان حاصل کیا جائے کہ ان کا اجراء ملک و قوم کے وسیع تر مفاد میں ہوگا اور اس کا بہترین طریقہ ایسے موقعوں پر ایک ایسے قومی فورم کی تشکیل ہے جس میں مختلف شعبہ حیات سے تعلق رکھنے والے ماہرین و مفکرین کے زیر نظر اس پالیسی کا کامل جائزہ لینا ہے۔ جیسے کہ ہم اس سے پہلی بحث میں بیان کرچکے ہیں کہ انسان غریزی طور پر دوسروں کو اپنی خدمت میں لینا چاہتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انسانی تاریخ کے آغاز سے قبیلوں اور قوموں کے درمیان طاقت کے حصول اور دوسروں پر تسلط کی خاطر جنگوں کا سلسلہ جاری رہا ہے۔ لیکن ہر دور میں جو بات نئی تھی وہ، جنگی ہتھیار اور حربے تھے۔ اور یہ ایک تاریخی حقیقت اور انسانی سماج کا مسلم قانون ہے جس سے گریز ممکن نہیں۔ اور یہ ہمیں اس بات کی طرف متوجہ کرتا ہے کہ اس بقاء کی جنگ میں کامیابی سے ہمکنار ہونے کے لئے ہمیشہ ہوشیار رہا جائے اور عصر جدید کی جنگی حکمت عملیوں اور اس کے ہتھیاروں کو پہچانیں۔ اس سیاق و سباق میں ہم سافٹ پاور کیا ہے؟ اور اس کے مؤثر ہتھیار کون سے ہیں؟ بہتر طور پر سمجھ سکتے ہیں۔

بیسوی صدی کی آخری دو دہایوں بالخصوص 9/11 کے بعد امریکی اور غربی سیاسی ماہرین ایک جدید عالمی حکمت عملی کی ضرورت کا احساس کر رہے تھے۔ تاکہ دنیا میں آنے والی نئی سیاسی، معاشی اور میڈیا کے شعبہ میں انقلابی تبدیلیوں اور صورتحال (جس میں خود ان مغربی عوام میں امریکی جنگی جنون کے خلاف بڑھتی ہوئی مخالفت، ایشاء اور عالم اسلام کی نسبت مخاصمانہ اور جنگی پالیسیوں کی وجہ سے امریکہ مخالف جذبات میں شدت اور چین کی تیزی سے ابھرتی ہوئی معاشی طاقت) میں اپنی متزلزل عالمی سیادت و قیادت کو برقرار رکھ سکیں۔ اس جدید عالمی نظام کی تشکیل کے لیے دو نسخے تشخیص دیے گئے ایک "لبرل ڈیموکریسی" اور دوسرا "مغربی تہذیب" کا فروغ تھا۔

لہٰذا سب نے دیکھا کہ گذشتہ دو، تین دھائیوں میں مغربی مفکرین بالخصوص امریکی ماہرین سیاست، مفکرین اور عالمی انسانی حقوق کی تنظیمیں، اقوام متحدہ جیسے عالمی اداروں (کہ جن پر مغربی حکومتوں کی اجارہ داری اور کامل اثر و رسوخ کسی سے پنہاں نہیں) کی جانب سے بین المللی مسائل و مشکلات کے حل کے لئے نئے نئے نظریات، نئی عالمی اسٹراٹیجی اور پالیسیاں سامنے آئیں۔ ان میں ہر مفکر اور ادارے نے اپنی ایکسپرٹیز، شعبہ تحقیق اور اپنے کام کے محدودہ کو سامنے رکھتے ہوئے موجودہ صورتحال کو بہتر بنانے اور انسانیت کی فلاح و بہبود اور ترقی کی بات کی لیکن سب کا اصل مقصد ایک ہی تھا اگرچہ طریقہ کار الگ الگ اور وہ دنیا کی قوموں اور ان کے وسائل پر اپنا کامل کنٹرول۔

ان سیاسی حکمت عملیوں اور نظریات میں سب سے زیادہ شہرت جس نظریہ کو ملی وہ ہارورڈ یونیورسٹی کے پروفیسر اور امریکی وزارت خارجہ سے تعلق رکھنے والے جازف نائی کا "سافٹ پاور کا نظریہ تھا" مسٹر جازف اپنے نظریہ اور اس کے کام کرنے کے طریقے کو اس طرح بیان کیا ہے " نرم طاقت کیا ہے؟ یہ اپنے مقاصد کو لالچ یا دھمکی کہ بجائے جذابیت سے حاصل کرنے کی صلاحیت ہے۔ یہ طاقت کسی ملک کی ثقافت، سیاسی نظریات، اور پالیسیوں سے نشات پاتی ہے۔ جب ہماری پالیسیاں دوسروں کی نظر میں جائز و مشروع دکھائی دیے تو، اس کا مطلب یہ کہ ہماری نرم طاقت میں اضافہ ہوا ہے۔ امریکہ کے پاس یہ طاقت ایک طویل عرصہ سے موجود تھی۔ دوسری جنگ عظیم کے اختتام پر یورپ میں فرینکلن روزویلٹ کی چار آزادیوں کے اثرات۔ ریڈیو فری یورپ پر امریکی موسیقی اور خبروں کو شوق سے سننے نوجوانوں؛ تیانمین اسکوائر میں چینی طلباء کی جانب سے مجسمہ آزادی کی نقل تیار کرکے اپنے مظاہروں کی علامت بنانا۔

2001ء میں نئے آزاد ہونے والے افغان باشندوں کی طرف سے حقوق کے بل کی کاپی طلب کرنا اور آج جو ایرانی نوجوان اپنے گھروں میں چھپ کر امریکی غیر قانونی ویڈیوز اور سیٹیلائٹ ٹیلی ویژن کی نشریات کو بڑی دلچسپی سے دیکھتے ہیں یہ سب امریکی سوفٹ پاور کی مثالیں ہیں۔"[14] اس نظریہ کی روح سے کسی ملک کی ثقافت اور تعلیمی نظام اس کے نرم ہتھیار ہیں۔ جن کی مدد سے کوئی بھی ملک دوسرے ملک میں، دھونس و دھمکی یا

طاقت کے استعمال کے بغیر اپنے سیاسی و معاشی مقاصد کو حاصل کر سکتا ہے۔ جس سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ ملک عزیز کے تعلیمی اور ثقافتی شعبہ میں امریکا اور عالمی اداروں کی بڑھتی ہوئی دلچسپی اور مالی و تعلیمی معاونت انسانی ہمدردی کی بنیادوں پر نہیں ہیں بلکہ حقیقت میں اسی سیاسی ایجنڈے کا تسلسل ہے۔

6۔ مقاصد، ابہامات، اعتراضات اور دلائل

2030 پالیسی کے مقاصد، متشابہہ عبارات اور اس پر معتقدین کے بیانات کا جائزہ لینے کے بعد جو نتائج سامنے آتے ہیں، ان کو نکات کی صورت میں اپنے اہل فکر وتدبیر قارئین کے لیے پیش کر رہے ہیں:

ا۔ ریاستی خود مختاری کے خلاف ایک نئی عالمی سازش

ناقدین کے دلائل اور اعتراضات کا بغور مطالعہ کرنے کی بعد اس بات کا بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ SDGS مقتدر سرمایہ دار طاقتوں کی ایک عالمی حکومت کا مقدمہ ہے، اس لیے مختلف ذی نفوذ اور مقتدر قدرتوں کی جانب سے اس عالمی تحریک کو اپنے مقاصد کے لئے استعمال کرنے کے لئے بھرپور کوشش کی گئی ہیں۔ فیملی واچ انٹرنیشنل کی صدر شارون سلاٹر نے اس بات کو صراحت کے ساتھ لکھاہے "یہ کوئی راز نہیں ہے کہ ایس ڈی جیز کے مدّ نظر اقوام متحدہ کے ممبر ممالک کی سماجی، سیاسی اور معاشی ترقی کے شعبوں میں اپنی من پسند بنیادی تبدیلیاں لانا ہے، جن کے بہت ہی دور رس اثرات مرتب ہونگے۔ اسی وجہ سے، اقوام متحدہ کی ایجنسیاں، حکومتیں، بین الاقوامی ادارے، بڑے لابنگ گروپس، کاروباری، ارب پتی مخیّر حضرات، تعلیمی ادارے، سماجی انصاف کے کارکنان، سول سوسائٹی گروپس، اور دیگر اپنے نظریات کو آگے بڑھانے کے لئے ایس ڈی جی کو تشکیل دینے کی بھرپور کوششیں کر رہے ہیں- اور اس سلسلے میں اپنے تمام مالی و علمی اور سیاسی رسوخ استعمال کر رہے ہیں جو بہت سے معاملات میں، انتہائی متنازع ہیں۔[15]

رابرٹ ڈیوڈ اسٹیل یونسیکو کی غیر جانبداری کو رد کرتے ہوئے اس کو ایک مخصوص سرمایہ دار طبقہ کا آلہ کار کہتے ہیں۔ "اقوام متحدہ کی تعلیمی، سائنسی اور ثقافتی تنظیم (یونیسکو)، اقوام متحدہ کا ایک بے ایمانی اور غیر فعال عنصر ہے۔ جو سیکرٹری جنرل کو جوابدہ نہیں ہے، نا ہی ان کا خصوصی ایجنسیوں پر کوئی کنٹرول ہے۔ اس ادارے کو دنیا کے لوگوں کی خدمت کی کوئی فکر نہی یہ صرف اپنے مالدار ڈونرز کے مفادات کا محافظ ہے۔ تعلیمی نظام پر نظر ثانی: کے ذریعے عالمی مسائل میں بہبود وبہتری؟ ایک پروپیگنڈا دستاویز ہے۔ "ہومنٹیرین" کا بیانیہ صرف ایک عالم گیر ہدف تک پہنچنے کا وسیلہ ہے جس کے تحت تمام اقوام عالم کو مغرور طاقتوں کے سہارے کارپوریٹ فاشسٹ ایجنڈے میں تبدیل کرنا چاہتا ہے"[16]

ii۔ ملکی آئین اور اجرائی قوانین میں اصلاحات کا مطالبہ خطرہ کی گھنٹی

کسی بھی ملک کے آئین اور قوانین میں ایسی اصلاحات کا مطالبہ جس سے اس قوم کی تہذیبی، دینی اور سماجی اقداروں کی نفی، تضعیف یا تضحیک ہوں، اور ان کی جگہ نئے سماجی قوانین اور اقداریں لے لیں، حقیقت میں ایسی اصلاحات اس ملک کی سالمیت کو نقصان پہنچانے کے مترادف ہے۔ یہ وہ خطرہ ہے جس کا ناقدین نے صراحت کے ساتھ اعلان کیا ہے۔ (SDGS) کے مقاصد کی نوعیت اور ان کے نتیجے میں پیدا ہونے والی تبدیلیوں سے یہ بات بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ ان قانونی اصلاحات کا مقصد ایسے تمام سماجی، معاشی اور حقوقی قوانین کو تبدیل کرنا ہے جو ہماری اسلامی ثقافت، قومی روایتوں کے پاسدار ہیں۔ اور جن کی وجہ سے ہمارا دینی اور قومی تشخص قائم ہے۔ کیونکہ یہ قوانین ان کے پنہاں مقاصد کی راہ میں رکاوٹ ہیں لہٰذا ان کو بہت ہی غیر محسوس طور پر ترقی، حقوق بشر اور برابری اور انتہاپسندی کے خاتمے کا نام پر تبدیل کرنا چاہتے ہیں۔

محترمہ شارون اپنے تنقیدی جائزہ میں اس 2030 کیے مقاصد اور اسے ممالک کے آئینوں پر پڑھنے والے اثرات کو بیان کرتے ہوئے لکھتی ہیں "ایجنڈے کے 17 بنیادی مقاصد اور 169 اہداف ہیں، جنہیں اجتماعی طور پر "پائیدار ترقیاتی اہداف" (SDGS) کے نام سے جانا جاتا ہے، اس ایجنڈے کے تحت متعدد بلند مقاصد طے کیے گئے جن سے اگلے 15 سالوں میں اقوام متحدہ اور ممبر ریاستوں کی پالیسیاں، پروگرامنگ اور اخراجات چلانے کی توقع کی جاتی ہے۔ ایس ڈی جی کے ذریعے بہت سارے شعبہ حیات میں قانونی اصلاحات لانے کی توقع کی جارہی ہے، اور اربوں ڈالر کی فنڈنگ سے دنیا بھر کے ممالک میں ان کے نفاذ میں مدد ملے گی۔[17]

ملکی آئین میں ایسی تبدیلی جس سے ہماری تہذیبی، ثقافتی اقداریں اور دو قومی نظریہ جو اس مملکت خداداد پاکستان کے وجود میں آنے کا اصلی سبب اور اس کی بقاء کا ضامن ہے غیر قانونی قرار پائے، جس کا مطلب ملکی سالمیت کو خطرہ سے دوچار کرنا ہے۔ یہ اس پالیسی کا سب سے نمایاں منفی پہلو ہے جسے مختلف شعبہ حیات سے تعلق رکھنے والی سیاسی و سماجی شخصیات نے بیان کیا ہے بقول شارون سلاٹر" منفی پہلو میں، ان تصورات کو آگے بڑھانے والے پوشیدہ حوالہ جات پورے 2030 کے ایجنڈے میں بکھرے ہوئے ہیں۔ نیز، اقوام متحدہ کے مذاکرات کے دوران، کنبے کے تحفظ، خاندان کے کردار کو تسلیم کرنے، اپنے بچوں کے حوالے سے والدین کے حقوق اور کردار کو تقویت دینے، اور مذہبی اور ثقافتی اقدار کے احترام کی ترغیب دینے والی دفعات کی شمولیت کے لیے متعدد ممبر ممالک کی جانب سے بار بار مطالبہ کے باوجود مسترد کر دیا گیا تھا"[18]

iii۔ آزادی کی آڑ میں ریاست کے نظریاتی مخالفین کا تحفظ

آزادی انسان کا فطری حق ہے، جسے اللہ تعالی نے اس کے وجود میں ارادہ جیسی صفت کے زریعہ رکھا ہے۔ اور ہر مذھب اور آئین میں اس حق کو تسلیم کیا جاتا ہے۔ لیکن کائنات، انسان اور معاشرتی زندگی کے بارے میں بنیادی تصورات میں ایک دوسرے سے اختلاف ہونے کی وجہ سے۔ اس کی حدود و ثغور کے تعین میں ایک دوسرے سے فرق کرتے ہیں۔ اسلیے ہر ملک میں آزادی بیان، سیاسی و مذھنی حقوق کی تعریف اور حدود میں فرق ہے۔ اور ریاستی خود مختاری پر قائم عالمی نظام کی بقاء اور عالمی تنازعات سے بچنے کا طریقہ یھی ہے کہ، ریاستی آئین میں مداخلت نا کی جائے اور ان کا احترام کیا جائے۔ لیکن 2030 کے کچھ اھداف کا من و عن اجراء ہماری ریاستی سالمیت کیلیے خطرناک ثابت ہوسکتا ہے۔ جس کی ایک مثال اس پالیس کا ہدف نمبر10 و 16 ہیں جس کو "FUNDAMENTAL FREEDOMS" عنوان دیا گیا ہے۔ جس کے مطابق دنیا کے ہر ملک قومی قانون سازی اور بین الاقوامی معاہدوں کے مطابق معلومات تک عوامی رسائی اور بنیادی آزادیوں کے تحفظ کو یقینی بنائے۔ اور ایجنڈا 2030 پیرا گراف 19: ہم اقوام متحدہ کے میثاق کے موافق، نسل، رنگ، جنس، اور کسی بھی زبان، مذہب، سیاسی یا دوسری رائے، قومی یا معاشرتی اصلیت، املاک، پیدائش، معذوری یا دوسری حیثیت۔ امتیاز کے بغیر، سب کے لئے انسانی حقوق اور بنیادی آزادیوں کا احترام، تحفظ اور فروغ دینے کے لئے، تمام ریاستوں کی ذمہ داریوں پر زور دیتے ہیں۔[19]

iv۔ اسلامی تہذیب پر کھلی یلغار

ہر ذی شعور اور تہذیبوں کے درمیان فاحش اختلاف اور اس کے کسی بھی آزاد ریاسیت کی سالمیت پر خطرناک آثرات سے آگاہ انسان اس پالیسی کے مطالعہ کے بعد اس نتیجہ پر پھچتا ہے کہ یہ پالیسی ہماری اسلامی تہذیب اور اخلاقی اقداروں پر یلغار ہے۔ " متعدد شرائط جو 2030 کے اقوام متحدہ کے ایجنڈے کے نتائج کی دستاویز میں ظاہر ہوتی ہیں وہ بھی ایسی اصطلاحات ہیں جو عام طور پر ہم جنس پرستوں، ہم جنس پرستوں اور ٹرانسجینڈر حقوق کو آگے بڑھانے کے لئے استعمال کی جاتی ہیں۔ یہ سوچنا بھی غلط ہوگا کہ ان شرائط کا شامل ہونا ریاستہائے متحدہ، یوروپی یونین، اور دیگر ممالک کی طرف سے جان بوجھ کر نہیں تھا جن پر جارحانہ طور پر زور دیا گیا تھا، لیکن وہ اس میں شامل ہونے میں ناکام رہے، ایسی شقیں جو ایس ڈی جی اہداف میں ایل جی بی ٹی کے حقوق کو فروغ دیتی ہیں۔ اور اہداف۔ در حقیقت، امریکہ سمیت متعدد ترقی یافتہ ممالک کے حکومتی رہنماؤں نے اعلان کیا ہے کہ ایل جی بی ٹی کے حقوق کو دوسرے ممالک میں فروغ دینا اولین خارجہ پالیسی کی ترجیح ہے"[20]

۷۔ خاندانی نظام کی تضعیف، جنسی بے راہ روی اور اخلاقی فساد کی قانونی حمایت

اسلامی تہذیب کی بقاء کا ایک اہم راز اس کا مظبوط عائلی نظام اور اخلاقی اقداریں ہیں۔ جس کو اس پالیسی کے ذریعے کامل طور حقوق و تعلیم کے نام پر بے اثر یا نابود کرنے کی کوشش کی گئی ہے، "اقوام متحدہ کی ایس ڈی جی مذاکرات کے دوران رونما ہونے والے مباحثوں سے یہ بات واضح ہے کہ کچھ ترقی یافتہ ممالک اور اقوام متحدہ کی ایجنسیوں نے ایس ڈی جی کے متعدد اہداف کی ترجمانی کرنے کا ارادہ کیا ہے تاکہ متنازعہ جنسی اور اسقاط حمل کے حقوق، ایل جی بی ٹی حقوق، اور جنسی استحصال کے جامع تعلیم کے حق کو۔ والدین کی معلومات اور رضامندی کے بغیر۔اجرا کیا جاس کے۔ لہٰذا، ریاستوں کو یہ یقینی بنانے کے لئے اقدامات اٹھانا چاہئے کہ SDGS میں ظاہر ہونے والی بہت سی مبہم اور کھلی ہوئی شرائط کو خاندانوں کے لئے نقصان دہ طریقوں سے غلط تشریح نہیں کیا جائے گا، یا اس سے بچوں کی معصومیت کو ختم کیا جائے گا۔[21]

مثال کے طور پر، اس پالیسی میں تجویز پیش کی گئی ہے کہ (I) بچوں کے اندر ایل جی بی ٹی کی نسبت مثبت رجحان پیدا کیا جائے (II) بچوں کو والدین کی رضامندی کے بغیر اسقاط حمل اور (ناجائز اولاد کی) پیدائش کیلیے سہولیات فراہم کی جائے (III) جامع جنسی تعلیم کے نام پر ان میں جنسی بے راہ روی کو رواج دینے پر زور دیا گیا ہے۔ ان تجاویز کا مقصد ایک اسلامی معاشرے کو ایک ایسی راہ پر ڈالنا ہے جس کے بعد نا تو عائلی نظام باقی رہے گا اور نا ہی ہماری اسلامی اور مشرقی اقداریں بلکے معاشرے پر ہوس رانی، شہوت پرستی، بے حیائی کا راج اور لاواث حرام زادے، بے سر پرست بچوں کی بہرمار ہو گی۔ اور جب اس فقیر معاشرے میں کوئی پرورش اور دیکھ بھال کرنے والا نہ ہوگا تو یہ بے گنا ہ معصوم بچے خطرناک مجرم اور سفاک و بے رحم قاتل بن کر معاشرے کے امن کو تہ و بالا کر دے گے۔ " THE WORLD FAMILY MAP" کی سال 2017 کی رپورٹ ہمارے دعوے کی تصدیق کرتی ہے۔

اس رپوٹ میں ناجائز تعلقات کے بڑھتے ہوئے رجحان اور اس کے نتیجے میں خاندانی نظام اور بچوں کی زندگی پر پڑھنے والے منفی اثرات کا جائزہ لیا گیا ہے۔ اس سروے کے نتائج بھت پریشان کن ہیں۔ اس کے مطابق "اس سال کی تحقیق کا موضوع ناجائز تعلقات بچوں کی زندگی عدم استحکام کے بڑھاوں کا سبب ہے۔ امریکہ اور 16 یورپی ممالک میں سروے کے بعد یہ بات سامنے آئی ہے کہ وہ بچے جن کی ولادت والدین میں شادی کے بغیر ہوئی ہوتی ہے۔ 12 سال کی عمر میں ان کے والدین ایک دوسرے سے جدا ہو جاتے ہیں جبکہ شادی کے بعد تشکیل پانے والے خاندان کے بچے اس آفت و محرومی سے محفوظ رہتے ہیں۔ 100 ممالک کی بارے میں موجود اطلاعات سے یہ بات بھی سامنے آتی ہے کہ وہ جن ممالک میں خاندان شادی کے بعد تشکیل پاتے ہیں وہاں کا فیملی سیٹم ان ممالک کی نسبت جھاں لوگ شادی کے بغیر ہی بچے پیدا کرتے ہیں، بہت مستحکم ہے۔ 68 ممالک کے سروے سے یہ

بات سامنے آئی ہے کہ ناجائز جنسی تعلقات کے بڑھتے ہوئے رجحان سے خاندانی نظام کو نقصان پہنچ رہا ہے۔ دوسرے یہ کہ شادی اور یا بغیر شادی کے بچوں کی پیدائش کا خاندانی نظام کے استحکام اور بہبود یا عدم استحکام سے گہرا تعلق ہے۔"[22]

vi۔ مغربی فلسفہ و نظریہ زندگی کے مطابق ذہنی تربیت

تعلیمی ادارے وہ مقدس درسگاہ ہیں جہاں سے نئے علمی نظریات بیان، نئی ایجادات کشف، قومی لیڈر پروان چڑھتے اور قومی ثقافت کو پر و بال ملتے ہیں۔ لیکن آج ہمارے اکثر تعلیمی ادارے ان خصوصیات سے خالی نظر آتے ہیں۔ یہاں اپنے نہیں دوسروں کے نظریات رٹائے جاتے ہیں، نئی ایجاد کرنے والوں کی حوصلہ افزائی کے بجائے انہیں دوسروں کی تقلید سکھائی جاتی ہے اور کلچرل ایکٹیوٹیز کے نام پر انہیں دوسروں کی تہذیب میں ڈھالا جاتا ہے۔ آج ہماری یونیورسٹیز سے اچھے سائنسدان یا مفکر نہیں بلکے دوسرے کو کارخانوں کو چلانے والے اچھے ورکر اور لیبر پاس آوٹ ہوتے ہیں، جن کا سارا ہم و غم کسی مغربی ملک میں نوکری کی تلاش ہوتا ہے۔ اس کی بنیادی وجہ ہماری تعلیمی پالیسی آزاد نہیں ہے، بلکہ اس پر اغیار کا کنٹرول ہے۔ ہماری نئی نسلوں نے کیا پڑھنا ہے، کیسے پڑھنا ہے، کن اقداروں کو اپنانا ہے ، خلاصہ ہماری علمی و تہذیبی تقدیر کا فیصلہ دوسرے کرتے ہیں۔ کیونکہ ہم آزاد نہیں ہیں، اس میدان میں دوسروں سے پیچھے رہ گئے ہیں۔ ترقی و سروری آزاد قوموں کا نصیب بنتی ہے۔ جب وہ ایجوکیشن ایجنڈے پر اتنا زور دیتے ہیں تو واضح طور پر تو اس کا مطلب یہی ہے کہ ہمارے ملک سمیت دوسرے ممالک پر اپنے نظام کو مسلط کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس ایجنڈے کی ہدایات ، سفارشات اور اہم نکات اس امر کی نشاندہی کرتے ہیں کہ تعلیمی نظام طلباء کے فکر افکار کو اس انداز میں تشکیل دے کہ ان کا فلسفہ اور نظریہ زندگی مغربی فلسفہ کے مطابق ڈھل جائے۔

vii۔ مبہم اور ذو معنی تعبیرات کے ذریعہ متنازعہ مقاصد کا حصول

پالیسی کے اصل محرکین نے اس بات کے پیش نظر کہ اس کی بہت سے پالیساں ریاستوں کے سماجی ، سیاسی اور معاشی قوانین کے ساتھ متضاد ہیں۔ اور وہ ریاست پر حکومتی کنڑول کو ضعیف کرتی ہیں۔ جانبوجھ کر ان میں ابہام رکھا ہے اور ایسی اصلطاحات کا استعمال کیا ہے یا تو اس کے مختلف معنی اور تفاسیر کی جاسکتی ہیں یا ان کے معنا میں اتنی وسعت ہے کہ ان کی مدد سے متنازعہ شقوں کو شامل کیا جاسکے۔ جس کا ایک نمونہ "INCLUSIVE" اور "INCLUSION" ہیں۔ یہ الفاظ 2030 کے ایجنڈے میں 40 بار اور خاص طور پر اہداف اور اہداف میں پانچ بار ظاہر ہوتے ہیں۔ اگرچہ زیادہ تر لوگ "جامع" کی اصطلاح کو مثبت سمجھتے ہیں اور کسی گروہ کو ترقی سے باز نہیں رکھنا چاہتے ہیں، لیکن یہ اصطلاح ایل جی بی ٹی کے حقوق کو فروغ دینے کے لئے بھی استعمال کیا جاتا ہے۔ اس نکتے

کی وضاحت کے لئے اقوام متحدہ کی ایجنسیوں اور دیگر اداروں کی درج ذیل مثالوں پر غور کریں: "ایل جی بی ٹی انکلوژن اور معاشی ترقی کے مابین تعلقات،" کے عنوان سے یو ایس ایڈ کی 2014 کی ایک رپورٹ، "، ہم جنس پرست، لیسبین اور ٹرانس جینڈر کے سماجی شمولیت کی وجہ سے 39 ممالک میں معاشی ترقی پر پڑھنے والے اثرات کا تجزیہ کرتی ہے۔[23]

(GLSEN)، ریاستہائے متحدہ میں ایک بڑی ایل جی بی ٹی رائٹس آرگنائزیشن کے پاس، "ایل جی بی ٹی انکلوژن کلاس روم وسائل تیار کرنا،" کے عنوان سے ایک اشاعت ہے، جو "تمام طلباء کے لئے جامع اور تصدیق نصاب" کے بہترین طریقوں کی فراہمی کرتی ہے۔ اسباق میں "گے، ہم جنس پرست، لیسبین اور ٹرانسجینڈر (ایل جی بی ٹی) لوگوں، تاریخ اور واقعات کی مثبت نمائندگی شامل ہیں" اور طلباء کو "ایل جی بی ٹی - جامع نصاب" کی نمائش کرتے ہیں۔ ورلڈ بینک کی اس رپورٹ کے صفحہ 70 کے عنوان سے جن میں "شمولیت کے معاملات: مشترکہ خوشحالی کی فاؤنڈیشن" لکھا گیا ہے کہ "ہم جنس پرست، ہم جنس پرست، بایوسیکس اور ٹرانسجینڈر (ایل جی بی ٹی) افراد کو بہت سے، اگر زیادہ تر نہیں تو، ثقافتوں میں خارج کرنے کا نشانہ بنایا گیا ہے۔" اس رپورٹ کے صفحہ INDICATES میں اشارہ کیا گیا ہے، "کچھ شناختوں کو جنہیں کچھ عشروں قبل سماجی خارج یا شمولیت کے ذرائع کے طور پر تسلیم نہیں کیا گیا تھا آج بھی ایسی ہی شناخت ہے۔"[24]

viii۔ دوہرے معیار کی سیاست

اقوام متحدہ کی 75 سالہ تاریخ کے مطالعہ سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ اس عالمی ادارے اور اس کی پالیسیوں پر ہمیشہ مقتدر قوتوں کا اثر ورسوخ رہا ہے۔ اور انہوں نے اس کو اپنے مقاصد کے لئے استعمال کیا ہے۔ چاہیے مسئلہ کشمیر ہو یا فلسطین کی آزادی یا بوسنیاں و رنگون میں مسلمانوں کی نسل کشی یا موجودہ حالات میں بھارتی مسلمانوں کے خلاف ریاستی سرپرستی میں مذہبی استحصال اور ان کو ان کے بنیادی انسانی حقوق سے بدخلی کا مسئلہ۔ ایسے موقع پر اقوام متحدہ اور عالمی طاقتیں مجرمانہ خاموشی اختیار کرتی ہیں۔ لیکن جب اسلامی ممالک کی بات آتی ہے تو، ہمارے کسی بھی داخلی مسائل میں مداخلت اور ریاستی و تہذیبی اقداروں کو نقصان پہنچانے والے عناصر اور پالیسیوں کی شدت سے حمایت کرتے ہیں۔ ہمارے آئین سے لے کر، تعلیمی نظام میں بنیادی تبدیلی کا مطالبہ کرتے ہیں اور اس کے لئے عالمی اداروں کے زریعے حکومتوں پر سیاسی و معاشی دباو ڈالا جاتا ہے۔ اور ہماری حکومتوں کی طرف سے اپنے موقف میں کوئی خاطر خواہ حرکت نظر نہیں آتی جبکہ ہمارے پڑوسی ملک بھارت کی حکومت اپنے قومی و مذہبی مفادات کی حفاظت کے لئے کسی عالمی دباو میں نہیں آتی اور کسی بھی عالمی اداروں کے قوانین اور ایجنڈوں کی پروا نہیں کرتی۔ اس وقت عملی طور پر نریندر مودی نے پوری دنیا کو آگے لگا رکھا ہے اور سارے عالمی متوقع رد

عمل کو جوتے کی نوک پر رکھتے ہوئے جو کرنا تھا کر لیا ہے اور ابھی جو کرنا ہے وہ بھی کر گزرے گا۔ بھارتی پارلیمنٹ میں اس کی مختصر سی تقریر بھارت کے مستقبل کا سارا منظر نامہ واضح کر رہی ہے۔

ادہر دہلی، جہاں یہ سب کچھ پوری شدت سے ہو رہا ہے۔ امریکہ، مغرب، یورپ، ایمنسٹی انٹر نیشنل، انسانی حقوق کی تنظیمیں اور اقوام متحدہ' سب خاموش ہیں۔ بھارتی پارلیمنٹ مودی نے کہا ''ہندوستان میں رہنا ہے تو ہندوؤں کی طرح رہو۔ کوئی اقلیت، خواہ وہ کہیں سے بھی ہو' اگر وہ ہندوستان میں رہنا چاہتی ہے، یہاں کام کرنا چاہتی ہے، یہاں کھانا پینا چاہتی ہے' تو پھر اسے ہندوستانی زبان بولنی ہو گی' ہندی، گجراتی، پنجابی، بنگالی اور جنوبی ہندوستان کی زبانیں بولنا ہوں گی اور ہندوستان کے قوانین کا احترام کرنا ہوگا۔ اگر انہیں شریعت کے مطابق قوانین پسند ہیں اور وہ مسلمانوں والی زندگی گزارنا چاہتے ہیں تو ہم انہیں آگاہ کر رہے ہیں کہ ایسا کرنے کے لئے انہیں چاہئے کہ وہ وہاں چلے جائیں جہاں کی ریاستیں انہیں یہ سہولت فراہم کر سکتی ہوں۔

ہندوستان کو مسلم اقلیت کی قطعاً کوئی ضرورت نہیں۔ ان اقلیتوں کو بھارت کی ضرورت ہے لیکن ہم انہیں کوئی خصوصی رعایت دینے کے لئے تیار نہیں۔ ہم انہیں اس بات کی قطعی اجازت نہیں دیں گے کہ وہ ہمارے قوانین میں اپنی مرضی کے مطابق تبدیلیوں کا مطالبہ کریں۔ ہمیں اس بات کی کوئی پروا نہیں کہ وہ کتنی بلند آواز میں شور و غل کرتے ہیں اور نسلی و مذہبی امتیاز کے بارے میں آواز بلند کرتے ہیں۔ ہم اپنی ہندو ویدک تہذیب کی بے عزتی اور بے ادبی کو کسی صورت معاف نہیں کریں گے۔۔۔ جب معزز قانون ساز اسمبلی نئے قوانین وضع کرے تو اس کے ذہن میں ہونا چاہئے کہ بھارت کا قومی مفاد ہر شے پر مقدم ہو اور وہ یہ بات ان کے پیش نظر رہنی چاہئے کہ مسلم اقلیت کا تعلق بھارت سے نہیں ہے''25 بھارتی وزیر اعظم کی اس تقریر نے عالمی طاقتوں اور اداروں کی دوہری سیاست سے پردہ ہٹا دیا ہے۔ اور اس میں ہمارے حکمرانوں کے لئے بھی پیام ہے کہ وہ اپنے کسی قومی اور تہذیبی مسائل میں بیرونی دباو کو قبول نا کرے۔ اور کوئی بھی ایسی پالیسی جو اس کے لئے خطرناک ہوں اسے اپنے تہذیبی و قومی مفاد میں رد کر دے۔

ix۔ حکومت، قانونی ماہرین اور متعلقہ اداروں کی ذمہ داری

منتقدین سب نے اپنی اپنی تقاریر اور تنقیدی جائزہ میں اس بات کی تاکید کی ہے: تعلیمی، سماجی و قانونی ماہرین اور والدین کی یہ زمہ داری ہے کہ اس ایجنڈے میں ملکی خود مختاری، قومی سالمیت، اعلی انسانی و اخلاقی اقداروں، عائلی نظام اور بچوں کو درپیش مخفی اور بکھرے ہوئے خطرات کو اچھی طرح سمجھتے ہوئے اس کی روک تھام کے لیے متناسب راہ عمل پیش کرے۔ اور اپنے معاشرتی، تہذیبی تقاضوں اور عصری ضروریات کو مدّنظر رکھتے

ہوئے ایک مناسب اور جامع تعلیمی پالیسی پیش کرے اور دوسروں کو اس بات کی ہر گز اجازت نا دے کہ وہ اپنی مرضی سے ان کے سیاسی، معاشی اور سماجی امور اور آنے والی نسلوں کے بارے میں فیصلے کرے۔

x۔ خود مختاری اور آزادی کی حفاظت ضروری

اقوام متحدہ کے 2030 کا ایجنڈا ممبر ممالک کے لئے الزامی نہیں، یعنی حکوتیں اس کو من و عن اجراء کرنے کی پابند نہیں (ہمارے خیال میں یہ تنہا قانونی راہ ہے جس کو ضایع نہیں کرنا چاہیے۔ بلکہ اس کو استعمال کرتے ہوئے، اس ایجنڈہ سے کامل طور پر کنارہ کشی کرنی چاہیے تاکہ اس کے مضرات سے بچا جاسکے)۔ بہر حال، اس کو عملی کرنے کی صورت میں ملکی قوانین اور پالیسیوں پر گہرا اثر پڑے گا کیونکہ اس کے بھت سے مقاصد میں قومی قانون سازی میں قانونی اور قومی پالیسیوں میں تبدیلی لانے کا مطالبہ کیا گیا ہے۔

*****

حوالہ جات

1.Samuel P. Huntington, " The Clash of Civilization? " Foreign Affairs, Vol. 72, No. 3 (summer, 1993) 23.

2۔ محمد حسین، طباطبائی، المیزان فی تفسیر القران، ج4 (تہران، دار الکتب الاسلامیہ، 1420ھ) 106۔

3۔ سید محمد، رضی، *نہج البلاغہ*، ترجمہ سید ذیشان حیدر جوادی (گولہ گنج لکھنو، تنظیم المکاتب، 2005ء) 17۔

http://alhassanain.org/urdu/?com=book&id=399

4.Kenneth R. Conklin, " EDUCATION TRANSMITS A CULTURE " plus a quick look at the separatist agenda of some Native Hawaiian education initiatives) (c) Copyright 2002-2004, http://www.angelfire.com/hi2/hawaiiansovereignty/edtransmitsculture.html

5.KNOWLEDGE AND CURRICULUM, BHARATHIDASAN UNIVERSITY TIRUCHIRAPPALLI – 620 024:28.

6.http://jamileh.alamolhoda.com/

7.Huntington, The Clash of Civilizations: 22.

8. Joanna Davidson, "Humanitarian Intervention as Liberal Imperialism: A Force for Good? ", POLIS Journal Vol. 7, summer 2012 ISSN 2047-7651.page no.129.

9.Davutoglu, Ahmet, "The Clash of Interests: An Explanation of the World (Dis) order", Perceptions, December 97-February98:92.

10.10 Selcen oner, A BRIEF ANALYSIS OF FUKUYAMA'S THESIS "THE END OF HISTORY: 9.

https://archive.org/details/THEENDOFHISTORYBySelcenONER/page/n5/mode/2up

11.Huntington, The Clash of Civilizations: 26.

12۔ حسین طباطبائی، المیزان فی تفسیر القران،2-116۔

13۔ (پہلے) سب انسان ایک ہی دین (فطرت) پر تھے، (پھر جب ان میں باہمی اختلاف پیدا ہوئے) تو خدا نے انبیاء بھیجے۔ (جو نیکوکاروں کو) خوشخبری دینے والے (اور بدکاروں) کو ڈرانے والے تھے اور ان کے ساتھ برحق کتاب نازل کی (جس میں قانون تھا)۔ تاکہ لوگوں کے اختلاف کا فیصلہ کرے اور یہ اختلاف انہی لوگوں نے کیا جن کو وہ (کتاب) دی گئی تھی اور وہ بھی تب کہ جب کھلی ہوئی دلیلیں ان کے سامنے آچکی تھیں۔ محض بغاوت اور زیادتی کی بنا پر۔ تو خدا نے اپنے حکم سے ایمان والوں کو ان اختلافی باتوں میں راہِ حق کی طرف راہنمائی فرمائی۔ اور خدا جسے چاہتا ہے سیدھے راستے کی طرف راہنمائی فرماتا ہے۔ سورہ بقرہ: 213۔

14.Nye, Jr., Joseph S. "Soft Power" The means to success in world politics, New York: Public Affairs, 2004:9.

15.Sharon Slater, AN ANALYSIS OF THE UN 2030 SUSTAINABLE DEVELOPMENT AGENDA, the Hidden Threats to Life, Family, and Children:4.

FamilyWatchInternational.org.

16.Robert David Steele, "USESCO's 2030 document seeks to make children slaves of the hegemon" May 15, 2015.

http://english.khamenei.ir/news/4818/UNESCO-s-2030-document-seeks-to-make-children-slaves-of-the-hegemon.

17.Sharon Slater, AN ANALYSIS OF THE UN 2030 SUSTAINABLE DEVELOPMENT AGENDA: 5.

18.https://www.usaid.gov/sites/default/files/documents/15396/lgbt-inclusion-and-development-november-2014.pdf.

19.Sharon Slater, AN ANALYSIS OF THE UN 2030 SUSTAINABLE DEVELOPMENT AGENDA: 5.

20.Ibid.

21.ibid.

22.https://worldfamilymap.ifstudies.org/2017/files/WFM-2017-FullReport.pdf:20.

23. https://www.usaid.gov/sites/default/files/documents/15396/lgbt-inclusion-and-development-november-2014.pdf

24.Sharon Slater, AN ANALYSIS OF THE UN 2030 SUSTAINABLE DEVELOPMENT AGENDA, page no 10.

25۔ منافقت- خالد مسعود خان:

https://daleel.pk/2020/03/01/131374

کتابیات

1) Huntington, Samuel P." The Clash of Civilization?" Foreign Affairs, Vol. 72, No. 3 ,Summer, 1993

2) طباطبائی، محمد حسین، المیزان فی تفسیر القران، ج4، تہران، دار الکتب الاسلامیہ، 1420ھ۔

3) رضی، سید محمد، نہج البلاغہ، ترجمہ سید ذیشان حیدر جوادی، گولہ گنج لکھنو، تنظیم المکاتب، 2005ء۔

4) Conklin, Kenneth R." EDUCATION TRANSMITS A CULTURE" plus a quick look at the separatist agenda of some Native Hawaiian education initiatives) (c) Copyright 2002-2004, http://www.angelfire.com/hi2/hawaiiansovereignty/edtransmitsculture.html

5) KNOWLEDGE AND CURRICULUM, BHARATHIDASAN UNIVERSITY TIRUCHIRAPPALLI – 620 024. http://jamileh.alamolhoda.com/

6) Huntington, The Clash of Civilizations.

7) Joanna Davidson,"Humanitarian Intervention as Liberal Imperialism: A Force for Good? ", POLIS Journal Vol. 7, summer 2012 ISSN 2047-7651.

8) Ahmet, Davutoglu, "The Clash of Interests: An Explanation of the World ,Dis)order", Perceptions, December 97-February98,

9) Selcen oner, A BRIEF ANALYSIS OF FUKUYAMA'S THESIS "THE END OF HISTORY?". https://archive.org/details/THEENDOFHISTORYBySelcenONER/page/n5/mode/2up

10) طباطبائی، حسین، المیزان فی تفسیر القران۔

11) Joseph S.Nye, Jr., "Soft Power" The means to success in world politics, New York: Public Affairs, 2004,

12) Robert David Steele, "USESCO's 2030 document seeks to make children slaves of the hegemon" May 15, 2015. http://english.khamenei.ir/news/4818/UNESCO-s-2030-document-seeks-to-make-children-slaves-of-the-hegemon.

13) Sharon Slater, AN ANALYSIS OF THE UN 2030 SUSTAINABLE DEVELOPMENT AGENDA,

علامہ جوادی آملی کی نظر میں

تعلیم وتربیت کے بنیادی اصول

BASIC PRINCIPALS OF EDUCATION & UPBRINGING (From The viewpoint of Jawadi Amoli)

Syed Rizwan Naqvi
Dr.Sh.M.Hasnain

Abstract:

No doubt, education & upbringing is a basic objective of sending prophets as declared in Holly Quran. Ayatollah Allama Jawadi Amoli has presented the concept of education and upbringing (tarbiyat) from the viewpoint of Islam in a distinct way. For him, education is the conceptual development of a person to the level that he/ she could solve complicated scientific and conceptual issues. According to him, the preeminence of upbringing and purification of soul over education is like that of goal over means and real scholars (ulama) are those whom education and knowledge result in their spiritual upbringing. 8 basic foundations of education & upbring have been presented in this article according to the viewpoint of Allama Jawadi Amoli. These are: human ability for education & upbringing, purification, motivation, ridiculation, rationality, dignity and faith.

Key words: *Amoli, Education, Upbringing, Purification, Dignity, Faith.*

خلاصہ

اگر تعلیم وتربیت اگر ایک معاشرے کی روح قرار دیا جائے تو غلط نہیں ہو گا۔ یہ موضوع اس قدر اہم ہے کہ اللہ تعالی نے انبیائے اکرام کو مبعوث کرنے کا ہدف اور مقصد بھی تعلیم و تربیت، تزکیہ اور تہذیب نفس بیان فرمایا ہے۔ معروف فلاسفر اور مفسر قرآن آیت اللہ جوادی آملی نے تعلیم وتربیت کے معنی اور مفہوم کو ایک الگ اور منفرد انداز سے پیش کیا۔آپ کے مطابق تعلیم عبارت ہے انسان فکری اعتبار سے اس حد تک پہنچ جانے سے کہ مشکل اور پیچیدہ علمی و فکری مسائل حل کرسکے۔ آپ کے مطابق تعلیم وتربیت کاآپس میں گہرا ربط ہے اور حقیقی عالم وہی ہیں جن کی تعلیم، ان کی تربیت کاسبب بنے۔ان کے مطابق تعلیم وتربیت کی اساس وحی الٰہی اور عقل ہیں اور تعلیم وتربیت جبر واکراہ سے نہیں، بلکہ تشویق وترغیب کے ذریعے دی جاسکتی ہے۔

کلیدی کلمات: آملی، تعلیم، تربیت، تزکیہ، کرامت، ایمان۔

آیت اللہ جوادی آملی کی زندگی پر ایک طائرانہ نظر

آیت اللہ جوادی آملی کا شمار موجودہ زمانے کے مشہور دانشمندوں اور مفسرین میں ہوتا ہے۔ آپ نے دینی تعلیمی مراکز کی معروف شخصیات اور بزرگ اساتذہ سے کسب فیض کیا ہے اور آپ اسلامی علوم کے ماہر سمجھے جاتے ہیں۔ آپ نے ہزاروں قابل شاگردوں کی تربیت کی ہے اور بہت ساری معروف کتب کے مولف بھی ہیں۔ آپ بہترین اخلاق، کردار اور عمیق فکر کے مالک ہیں اور تشنگان علم کے لیے نمونہ عمل ہیں۔ آپ کی قرآن مجید سے محبت اور انس مثالی ہے۔ آپ ایران کے صوبہ مازندران کے شہر آمل میں 1312 ہجری شمسی بمطابق 1933 عیسوی میں ایک مذہبی اور روحانی گھرانے میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم اپنے ہی شہر سے حاصل کی۔ آپ نے ابتدائی دینی تعلیم اپنے والد میرزا ابوالحسن جوادی آملی اور چند دیگر علمی شخصیات سے حاصل کی اور ادبیات عرب، منطق، اصول فقہ، فقہ، تفسیر قرآن اور علم حدیث جیسے حوزوی مقدماتی اور استدلالی علوم پر صرف پانچ سالوں میں عبور حاصل کر لیا۔ آپ 1955ء میں قم کے دینی تعلیمی مرکز میں داخل ہوئے اور اپنے زمانے کے بزرگ علماء جیسے آیت اللہ بروجردی، آیت اللہ محقق داماد، آیت اللہ مرزا ہاشم آملی، امام خمینیؒ اور علامہ طباطبائی سے کسب فیض کیا۔ اسی دوران آپ نے مختلف علوم کی تدریس کا سلسلہ شروع کیا اور قرآن کی تفسیر کی تدریس پر خصوصی توجہ دی۔ آپ نے قرآن مجید کی تفسیر کا آغاز 1976ء سے کیا جو ابھی تک جاری ہے۔ دراصل، آپ کی تالیفات کا سرچشمہ آپ کا علمی اور عرفانی اخلاق ہے۔ تفسیر تسنیم آپ کی علمی اور عرفانی خصوصیات کا واضح نمونہ ہے۔ آزاد فکری اور جامع علمی شخصیت آپ کی عمدہ خصوصیات ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ آپ نے طبری، شیخ طوسی، ملا صدرا، محی الدین عربی، محمد عبدہ، فخر الدین رازی اور علامہ طباطبائی جیسے عالم اسلام کے بزرگ علماء کے نظریات پر نقد و تبصرہ کیا ہے۔ اور آپ کی جامعیت کی دلیل یہ ہے کہ آپ ادبیات و بلاغت، منطق و فلسفہ، کلام و عرفان، اصول و فقہ اور تفسیر و حدیث جیسے مختلف اسلامی علوم پر دسترس رکھتے ہیں۔ اس تمام تر فضل و کمال کے باوجود آپ کی فروتنی اور خشوع و خضوع بھی مثالی ہے۔

علامہ جوادی آملی کی تفسیری روش

کسی بھی مفسر کی تفسیری روش کا تعلق اس کے منابع سے ہوتا ہے۔ "تفسیر تسنیم" کے مفسر علامہ جوادی آملی کی نگاہ میں تفسیر قرآن کے منابع (Sources) قرآن وسنت اور عقل ہیں۔ اجمالی طور پر تفسیر تسنیم کی روش کو جامع اجتہادی روش کہا جا سکتا ہے۔ اس تفسیر کو "قرآن کی رو سے تفسیر" "سنت کی رو سے تفسیر" اور "عقل کی رو سے تفسیر" کا نام بھی دیا جا سکتا ہے۔ ان میں سے موثر ترین شیوہ اور روش "قرآن کی رو سے تفسیر"۔ تفسیر تسنیم کے

مفسر معتقد ہیں کہ قرآن کی رو سے قرآن کی تفسیر ہی پیغمبر اکرم ﷺ اور اہل بیتؑ کی تفسیری روش ہے جو ہر قسم کی غلطی اور خطا سے محفوظ ہیں اور ان کی پیروی ہمارے لیے نجات کا راستہ ہے۔

علامہ جوادی آملی اور تعلیم وتربیت

علامہ جوادی آملی تعلیم کی تعریف یوں کرتے ہیں کہ انسان فکری اعتبار سے اس حد تک پہنچ جائے کہ بدیہات (یعنی واضح وروشن چیزوں) کو اپنا منبع (source) قرار دے کر مشکل اور پیچیدہ علمی و فکری مسائل کو حل کر سکے۔ آپ معتقد ہیں کہ انسان علمی و عملی دو پہلوؤں کا حامل ہے اس کا علمی پہلو تعلیم کے ذریعے سے اور عملی پہلو تربیت کے ذریعے سے پرورش پانا چاہیے۔ اگر کوئی شخص علمی طور پر کمزور ہوگا تو وہ تربیتی پہلو سے بھی اتنا ہی کمزور ہوگا لہٰذا آپ نے تعلیم وتربیت کے اعتبار سے انسانوں کو چار گروہوں میں تقسیم کیا ہے۔ ۱) فاسق عالم؛ ۲) مقدس جاہل؛ ۳) فاسق جاہل؛ ۴) عادل عالم۔ آپ کے مطابق جو لوگ تعلیمی اعتبار سے ٹھیک لیکن تزکیہ و تربیت کے لحاظ سے کمزور ہیں وہ فاسق عالم ہیں۔ وہ لوگ جو فکر اور اندیشہ کے اعتبار سے کمزور لیکن عمل میں درست کار ہیں ایسے لوگ مقدس نما جاہل ہیں۔ وہ لوگ جو تعلیم وتربیت دونوں میں کمزور ہیں وہ جاہلِ فاسق ہیں اور ایسے لوگ جو تعلیم وتربیت دونوں میں ٹھیک ہیں وہ عادل علماء ہیں۔ انسان علمی طور پر جتنا آگے بڑھتا جائے گا وہ تربیت سے اتنا ہی قریب ہوتا جائے گا پھر ایک ایسے مقام پر پہنچ جائے گا جہاں تعلم ہی تربیت بن جائے گی۔[1]

تعلیم وتربیت کے بنیادی اصول

ہر علم کے اپنے مخصوص منابع، بنیادی اصول اور معلومات ہوتی ہیں۔ معلومات، بنیادی اصولوں سے اور بنیادی اصولوں کو منابع سے لیا جاتا ہے اس بنیاد پر علم کا اپنا ایک مبنی ہے۔ اسلامی تعلیم وتربیت کے بنیادی اصول، کلماتِ پروردگار اور دستوراتِ الٰہی ہیں اور اس کا منبع عقل و نقل ہے۔ نقل سے مراد کتاب و سنت ہے۔ دستورات الٰہی سے مراد قرآن مجید، آئمہ معصومینؑ کی سیرت اور فرمودات ہیں جو حقیقی مفسرِ قرآن ہیں۔ معصومین کی سیرت حقیقت میں تفسیرِ قرآن ہے کیونکہ آپ حقائق کو دوسروں سے بہتر جانتے ہیں۔ یہ جو ہم کہتے ہیں کہ اسلامی تعلیم وتربیت کا مبناء وحی الٰہی ہے اس کی بنیاد عقل ہے ہم وحی کی اہمیت اس کے مقام و منزلت اور معصومینؑ کی سیرت کو بھی عقل سے ہی لیتے ہیں پس تعلیم وتربیت کا مبنی بھی عقل ہی ہے کیونکہ جب عقل کا انکار کرتے ہیں تو وحی اور معصومینؑ کی سیرت کے بنیادی طور پر منکر قرار پاتے ہیں۔

وحی دین اور شریعت کے معنی میں نہیں بلکہ وحی کی مثال ایک قسم کی عقل یا شناخت ہے جس کے ذریعے سے ہم دین، شریعت اور خدا کے ارادہ تشریعی اور تکوینی کو کشف کرتے ہیں وحی، کلمات اور پیام الٰہی کو نزول کے ذریعے

سے مخاطبین تک پہنچاتی ہے جو وحی کو مستقیم حاصل کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتے ہیں انسان عقل کے ذریعے سے قرآن وسنت سے استفادہ کرتا ہے اسی لیے ہم کہتے ہیں کہ جو شخص عاقل نہیں وہ مخاطب وحی بھی نہیں ہے۔[2]

انسان، قابل تعلیم

تعلیم و تربیت کے قرآنی بنیادی اصولوں میں سے ایک اہم اصول، انسان کا قابل تعلیم ہونا ہے۔ قرآن انسان کو تعلیم و تربیت کے قابل قرار دیتا ہے۔ قرآن کے مطابق انسان تو کجا ایک ہدہد میں بھی یہ صلاحیت پائی جاتی ہے کہ حضرت سلیمانؑ کی تعلیم وتربیت کے بموجب بہت کچھ سیکھ لے۔ تو انسان جو کہ اشرف المخلوقات ہے، وہ کیوں کر تعلیم وتربیت نہیں پا سکتا؟ پس انسان قابل تعلیم وتربیت ہے اور انسان کی تعلیم وتربیت، انبیائے الٰہی کا اصل فریضہ ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے: كَمَا أَرْسَلْنَا فِيكُمْ رَسُولاً مِّنكُمْ يَتْلُو عَلَيْكُمْ آيَاتِنَا وَيُزَكِّيكُمْ وَيُعَلِّمُكُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَيُعَلِّمُكُم مَّا لَمْ تَكُونُواْ تَعْلَمُونَ۔(151:2) ترجمہ: ”جیسے ہم نے تمہارے درمیان خود تم ہی میں سے ایک رسول بھیجا جو تمہیں ہماری آیات پڑھ کر سناتا ہے اور تمہیں پاکیزہ کرتا ہے اور تمہیں کتاب و حکمت کی تعلیم دیتا ہے اور تمہیں ان چیزوں کی تعلیم دیتا ہے جو تم نہیں جانتے تھے۔“

اس آیت کے ضمن میں مفسر قرآن آیت اللہ جوادی آملی فرماتے ہیں کہ: "آیات الٰہیٰ کی تلاوت، کتاب کی تعلیم اور تزکیہ نفس دینی قوانین اور تعلیمات کا مجموعہ ہے یعنی دانش نظری و عملی اور واضح ومستحکم تعلیمات یعنی عقائد، اخلاق، فقہ، قانون اور واجب وحرام اوران جیسے دوسرے علوم کی تعلیم پیغمبر اکرم ﷺ کے اہداف میں سے ہیں۔ تلاوت سے مراد ایسی تعلیم ہے جو سامعین کو تدبر کی طرف کھینچے کلام الٰہیٰ، اللہ تعالی کے موجود ہونے پر دلالت کرتا ہے اسی لیے اس کو آیات سے تعبیر کیا گیا ہے۔"[3] تربیت اور تزکیہ پیغمبر اکرم ﷺ کی بعثت کا اہم ترین اور اصلی ہدف تھا اور تعلیم، تزکیہ کے لیے ایک وسیلہ ہے یہاں تربیت و تزکیہ کا تعلیم پر مقدم ہونا ہدف کا وسیلے پر مقدم ہونے کا معنی میں ہے۔ تزکیہ کا مقدم ہونا ایک اور بات کی طرف بھی اشارہ کرتا ہے کہ پیغمبر اکرم ﷺ پہلے لوگوں کو شرک کی نجاست سے پاک کریں پھر ان کو دینی احکام اور معارف الٰہیہ کی تعلیم دیں۔[4]

قرآن کریم میں پیغمبر اکرم ﷺ کو کتاب کی تعلیم کے ساتھ ساتھ، حکمت کا معلم بھی قرار دیا گیا ہے: وَيُعَلِّمُكُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ یعنی: (پیغمبر) تمہیں کتاب و حکمت کی تعلیم دیتا ہے۔ سوال یہ ہے کہ حکمت کیا ہے؟ علامہ جوادی آملی کے مطابق حکمت، دین کے مجموعی قوانین، دستورات اور ایسے واضح وروشن کلمات کو جو مختلف اسرار سے پردہ اٹھائیں حکمت کہا جاتا ہے۔ جیسے پیغمبر اکرم ﷺ پر نازل ہونے والی وحی اور الہام الٰہی کو حکمت کہتے ہیں۔ قرآن سراسر حکمت ہے: وَالْقُرْآنِ الْحَكِيمِ(2:36) ترجمہ: ”قسم ہے قرآن حکیم کی۔“ قرآن نے حکمت کو

خیر کثیر سے یاد کیا گیا ہے: وَمَن يُؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ أُوتِيَ خَيْرًا كَثِيرًا(2:269) ترجمہ: "اور جسے حکمت دی گئی گویا اسے کثیر خیر عطا کی گئی ہے۔" حکمت کی دو قسمیں ہیں: حکمت نظری اور حکمت عملی۔ حکمت نظری کا تعلق توحید باری تعالی سے ہے اور حکمت عملی کا تعلق اخلاق، فقہ اور انفرادی و اجتماعی حقوق سے ہے۔[5]

تزکیہ

علامہ جوادی آملی کے نظریات کی روشنی میں تعلیم و تربیت کے قرآنی بنیادی اصولوں میں سے دوسرا اہم اصول، تعلیم و تربیت میں تزکیہ کا خاص خیال رکھنا ہے۔ قرآن کریم میں کبھی تزکیہ کو تعلیم پر مقدم اور کبھی تعلیم کو تزکیہ سے پہلے قرار دیا گیا ہے۔ اس بارے میں یہ نکتہ قابل توجہ ہے کہ انبیاء کی بعثت کا اہم ترین ہدف لوگوں کا تزکیہ اور تہذیبِ نفس ہے اور اس اہم ہدف کے لیے تعلیم کی ضرورت ہے کیونکہ تعلیم، روحانی اور معنوی تربیت کا مقدمہ ہے اسی لیے اس آیت: رَبَّنَا وَابْعَثْ فِيهِمْ رَسُولاً مِّنْهُمْ يَتْلُو عَلَيْهِمْ آيَاتِكَ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَيُزَكِّيهِمْ۔(2:129) ترجمہ: "اے ہمارے رب! ان میں ایک رسول انہی میں سے مبعوث فرما جو انہیں تیری آیات سنائے اور انہیں کتاب و حکمت کی تعلیم دے اور انہیں (ہر قسم کے رذائل سے) پاک کرے"، میں تعلیم کو تربیت پر مقدم کیا گیا ہے۔ و گرنہ تزکیہ، تعلیم پر مقدم ہے کیونکہ انبیاء کی رسالت کا اہم ترین ہدف ہے اور احکامِ الٰہی اور دینی معارف اس اصلی ہدف تک پہنچنے کا وسیلہ ہیں اور ہدف وسیلہ پر مقدم ہے دوسری آیات جن میں تزکیہ کو تعلیم پر مقدم کیا گیا ہے وہ اسی وجہ سے ہے۔ تزکیہ کے تعلیم پر مقدم ہونے کی ایک اور وجہ یہ ہے کہ رسول اکرم ﷺ پہلے لوگوں کو شرک کی نجاست اور آلودگی سے پاک کریں اور بعد میں انہیں احکام اور دینی معارف کی تعلیم دیں۔ پیغمبر اکرم ﷺ کا ہدف و مقصد تعلیم و تزکیہ ہے تاکہ لوگوں کو جہالت اور آلودگی سے نکال کر علم و معرفت کی وادی میں لایا جائے اور تاکہ لوگ کمال اور ہدایت تک پہنچ سکیں۔

جہاں تک تزکیہ و تعلیم کی اقسام کا تعلق ہے تو علامہ جوادی آملی کے مطابق تزکیہ کی دو قسمیں ہیں: ابتدائی اور انتہائی۔ ابتدائی تزکیہ تعلیم سے پہلے ہے۔ کیونکہ جب تک کافر، پاک نہ ہو وہ خدا کے کلام کو توجہ سے نہیں سنے گا اور قرآن مجید توجہ کے ساتھ نہیں سنے گا۔ لہٰذا یہ ابتدائی تزکیہ، تعلیم سے پہلے ہے۔ لیکن انتہائی تزکیہ، روح کی پاکی اور طہارت کے ہمراہ ہے اور تعلیم کے بعد حاصل ہوتا ہے۔[6] جس طرح تزکیہ کی دو اقسام ہیں اسی طرح تعلیم کی بھی دو قسمیں ہیں ابتدائی اور انتہائی۔ ابتدای تعلیم علم حصولی اور تصور و تصدیق کے مبانی سے آشنائی کے ذریعے حاصل ہوتی ہے۔ یہ تعلیم، تزکیہ سے پہلے ہے۔ انتہائی تعلیم علم شہودی اور عرفان کی صورت میں علم الیقین، عین الیقین اور حق الیقین کے ہمراہ ہے۔ تعلیم کی یہ قسم قرآن کے پیغام "إِن تَتَّقُواْ اللّهَ يَجْعَل لَّكُمْ فُرْقَاناً ترجمہ: "اگر تم اللہ سے

ڈرو تو وہ تمہیں (حق و باطل میں) تمیز کرنے کی طاقت عطا کرے گا۔" (29:8) کی روشنی میں تقویٰ سے مدد لینے کے ذریعے "كَلَّا لَوْ تَعْلَمُونَ عِلْمَ الْيَقِينِ لَتَرَوُنَّ الْجَحِيمَ یعنی: "ہر گز نہیں! کاش تم یقینی علم رکھتے"، تو تم ضرور جہنم کو دیکھ لیتے۔" (5،6:102) کے مصداق کے طور پر علم الیقین اور حق الیقین کی منزل تک پہنچنے کا نام ہے۔ یہ تعلیم، تزکیہ کے بعد ہے۔ لیکن تزکیہ کا عروج عین معرفت ہے اور اس مقام پر تعلیم و تزکیہ ایک دوسرے سے جدا نہیں کہ کہا جائے ایک مقدم اور دوسرا موخر ہے۔ کیونکہ عارف اور صالح شخص کا علم، عین تزکیہ ہے۔ [7]

تزکیہ نفس کے عملی اقدامات

علامہ جوادی آملی کے مطابق انبیاء کی بعثت کا مقصد فقط تعلیم سے پورا نہیں ہوتا۔ اسی لیے قرآن مجید نے تزکیہ نفس کے عملی اقدامات تجویز فرمائے ہیں جو درج ذیل ہیں:

۱۔ دنیا کی محبت اور لالچ تمام برائیوں کا سرچشمہ اور انسان کو گھٹیا بنا دیتی ہے اسی لیے کنجوسی اور مال و دولت جمع کرنے کو خود اپنے آپ سے دشمنی قرار دیا گیا ہے: وَأُحْضِرَتِ الْأَنفُسُ الشُّحَّ (128:4) یعنی ہر نفس کو بخل کے قریب کر دیا گیا ہے۔ بنابریں، سعادت مند انسان وہ ہے جو تقوا کو اپنی ڈھال قرار دے کر خود کو اس اندرونی شر سے محفوظ رکھے: وَمَن يُوقَ شُحَّ نَفْسِهِ فَأُوْلَئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ (9:59) ترجمہ: "اور جو لوگ اپنے نفس کے بخل سے بچا لیے گئے ہیں پس وہی کامیاب لوگ ہیں۔" نفس کے بخل کی رذیلت سے بچنے کے لئے صدقہ ،زکات اور دوسرے واجب حقوق کو ادا کرنا ضروری قرار دیا گیا ہے جو کہ روح کی پاکی اور تزکیہ کا سبب ہے۔ ارشاد باری تعالی ہے: خُذْ مِنْ أَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً تُطَهِّرُهُمْ وَتُزَكِّيهِم بِهَا وَصَلِّ عَلَيْهِمْ إِنَّ صَلاَتَكَ سَكَنٌ لَّهُمْ وَاللّهُ سَمِيعٌ عَلِيمٌ(103:9) ترجمہ: "(اے رسول) آپ ان کے اموال میں سے صدقہ لیجیے، اس کے ذریعے آپ انہیں پاکیزہ اور بابرکت بنائیں اور ان کے حق میں دعا بھی کریں، یقیناً آپ کی دعا ان کے لئے موجب تسکین ہے اور اللہ خوب سننے والا، جاننے والا ہے۔" قرآن کریم کی کئی آیات اس بات پر دلالت کرتی ہیں کہ اپنے مال کی زکات ادا کرنا، دوزخ سے نجات کا سبب ہے۔(14-18:92) کامیاب انسان وہ ہے جو فطرہ ادا کرے، خدا کو یاد کرے اور نماز ادا کرے: قَدْ أَفْلَحَ مَن تَزَكَّى وَذَكَرَ اسْمَ رَبِّهِ فَصَلَّى (14،15:87) ترجمہ: "بتحقیق جس نے پاکیزگی اختیار کی وہ فلاح پا گیا، اور اپنے رب کا نام یاد کیا پھر نماز پڑھی۔"

۲۔ علامہ جوادی آملی کے مطابق قرآن کریم میں بت پرستی اور روح کی پلیدگی سے بچاو کو تزکیہ نفس کا دوسرا اہم عامل قرار دیا گیا ہے۔ ارشاد باری تعالی ہے: فَاجْتَنِبُوا الرِّجْسَ مِنَ الْأَوْثَانِ وَاجْتَنِبُوا قَوْلَ الزُّورِ(30:22) ترجمہ: "پس تم لوگ بتوں کی پلیدی سے اجتناب کرو اور جھوٹی باتوں سے پرہیز کرو۔" ایک اور جگہ ارشاد ہوا ہے: يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُواْ إِنَّمَا الْمُشْرِكُونَ نَجَسٌ فَلاَ يَقْرَبُواْ الْمَسْجِدَ الْحَرَامَ بَعْدَ عَامِهِمْ هَذَا وَإِنْ خِفْتُمْ عَيْلَةً

فَسَوْفَ يُغْنِيكُمُ اللّهُ مِن فَضْلِهِ إِن شَاءَ إِنَّ اللّهَ عَلِيمٌ حَكِيمٌ (9:28) ترجمہ: "اے ایمان والو! مشرکین تو بلاشبہ ناپاک ہیں لہٰذا اس سال کے بعد وہ مسجد الحرام کے قریب نہ آنے پائیں اور اگر (مشرکین کا داخلہ بند ہونے سے) تمہیں غربت کا خوف ہے تو (اس کی پرواہ نہ کرو) اگر اللہ چاہے تو جلد ہی تمہیں اپنے فضل سے بے نیاز کر دے گا یقینا اللہ بڑا جاننے والا، حکمت والا ہے۔"

۳۔ اسلامی آداب ورسوم کی پابندی، تزکیہ نفس کے عملی اقدامات میں سے تیسرا اہم اقدام شمار کیا گیا ہے۔ علامہ جوادی آملی کے مطابق اسلامی آداب کی رعایت جیسے کسی کے گھر میں داخل ہونے سے پہلے اجازت لینا، اہل خانہ کو سلام کرنا، بغیر اجازت کے کسی کے گھر میں نہ جانا اسی طرح کے دوسرے اسلامی آداب روح کی پاکیزگی کا سبب ہیں کیونکہ متواضع ہونا طہارت و پاکی کا سبب ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے: يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَدْخُلُوا بُيُوتًا غَيْرَ بُيُوتِكُمْ حَتَّى تَسْتَأْنِسُوا وَتُسَلِّمُوا عَلَى أَهْلِهَا ذَلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُونَ فَإِن لَّمْ تَجِدُوا فِيهَا أَحَدًا فَلَا تَدْخُلُوهَا حَتَّى يُؤْذَنَ لَكُمْ وَإِن قِيلَ لَكُمُ ارْجِعُوا فَارْجِعُوا هُوَ أَزْكَى لَكُمْ وَاللهُ بِمَا تَعْمَلُونَ عَلِيمٌ (24:28،27) ترجمہ: "اے ایمان والو! اپنے گھروں کے علاوہ دوسروں کے گھروں میں داخل نہ ہونا جب تک اجازت نہ لے لو اور گھر والوں پر سلام نہ کرلو، یہ تمہارے لیے بہتر ہے شاید تم نصیحت حاصل کرو۔ اور اگر تم اس گھر میں کسی کو موجود نہ پاؤ تو بغیر اجازت کے اس میں داخل نہ ہونا اور اگر تم سے لوٹ جانے کے لیے کہا جائے تو لوٹ جاؤ، اسی میں تمہاری پاکیزگی ہے اور اللہ تمہارے اعمال سے خوب آگاہی رکھتا ہے۔" خلاصہ یہ کہ تزکیہ نفس سعادت اور کامیابی کا سبب ہے: قَدْ أَفْلَحَ مَن زَكَّاهَا (91:9) ترجمہ: " بتحقیق جس نے اسے پاک رکھا کامیاب ہوا۔" اور تزکیہ نفس تقوا کے بغیر ممکن نہیں۔ تزکیہ نفس دل کی پاکی کا بھی موجب ہے اور علمِ نافع کا سبب ہے جس کی اولیائے کرام نے تاکید فرمائی ہے ورنہ علم غیر نافع سے پناہ مانگی گئی ہے۔ اعوذبك من علم لا ينفع"[8] یعنی: "میں ایسے علم سے پناہ مانگتا ہوں جس کا کوئی فائدہ نہ ہو۔"

تشویق وترغیب

علامہ جوادی آملی کے مطابق تعلیم وتربیت کے بنیادی اصولوں میں سے تیسرا بنیادی اصول، بذریعہ تشویق و ترغیب، تعلیم وتربیت ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے: وَلِيَعْلَمَ اللهُ مَن يَنصُرُهُ وَرُسُلَهُ بِالْغَيْبِ (57:25) یعنی: "تاکہ اللہ معلوم کرے کہ کون بن دیکھے خدا اور اس کے رسولوں کی مدد کرتا ہے۔۔۔ اس آیت میں الٰہی تعلیم وتربیت میں تشویق کا پہلو جھلکتا نظر آتا ہے۔ تاہم آپ کے مطابق تعلیم وتربیت میں تشویق وترغیب کے لئے مربی اور استاد کے پاس اختیارات اور حکومتی منصب کا ہونا ضروری ہے۔ لہٰذا اسلام میں حکومت کی تشکیل ضروری ہے۔ اسلام

میں حکومت کا تصور اور قیام من مانی کا سیاسی نظام قائم کرنا نہیں، بلکہ اس کا مقصد لوگوں کی تعلیم وتربیت ہے۔ پس اسلام میں تعلیم وتربیت کا بنیادی اصول تشویق وترغیب ہے۔

البتہ علامہ جوادی آملی کے مطابق جرائم پیشہ لوگوں اور قانون کی خلاف ورزی کرنے والوں کے ساتھ سختی سے پیش آنا اور انہیں جسمانی سزا دینا بھی غلط اور غیر منطقی نہیں ہے اور نہ ہی تعلیم وتربیت کے منافی ہے۔ آپ کے مطابق قرآن کریم کی وہ آیات جن میں جبر واکراہ کی نفی کی گئی ہے (القرآن: 256:2)، یا آپ ﷺ کو زبردستی نہ کرنے والا قرار دیا گیا ہے۔(القرآن: 56:28؛ 45:50؛ 22:88)، ان میں تکوینی امور کی طرف اشارہ ہے، نہ تشریعی امور کی طرف۔ کیونکہ شریعت محمدی میں آپ ﷺ کا فریضہ امر بالمعروف، نہی عن المنکر اور جرم و جنایات پر سزا دینا ہے۔ بنابریں، منکر کا مرتکب اور مجرم چاہے طالب علم بھی کیوں نہ ہو، اسلامی شریعت کی روشنی میں اسے سزا دینا منطقی، متین اور جائز ہے۔

سائنسی علوم کی ترقی

علامہ جوادی آملی کے مطابق تعلیم وتربیت کے بنیادی اصولوں میں سے چوتھا اہم اصول، سائنسی علوم کی ترقی اور کائنات کی تسخیر پر توجہ ہے۔ آپ کے مطابق مسیحیت کا المیہ یہ ہے کہ حضرت عیسیٰؑ کے بعد عیسائی پادریوں نے اپنے ذاتی مفادات اور مقاصد کے لیے عیسیٰ کے دین میں تحریف کی اور دین کی ایسی تفسیر پیش کی جو عقلی قواعد اور اصولوں کے خلاف تھی۔ اس تفسیر نے تسخیر کائنات اور سائنسی علوم کی ترقی میں رکاوٹیں کھڑی کیں جس کے نتیجہ میں مختلف علوم کے دانشمند، دین اور سائنسی ترقی میں جدائی کے قائل ہوگئے اور انہوں نے یہ کہنا شروع کردیا کہ علم اور دین کا آپس میں کوئی رشتہ نہیں ہے اور دین، خرافات اور خیالی و ذہنی تصورات کا مجموعہ ہے۔[9] لیکن حقیقت یہ ہے کہ دینی تعلیمات اس کے برعکس ہیں۔ علم اور دین ایک دوسرے کے مخالف نہیں بلکہ ایک دوسرے کے مددگار بھی ہیں۔ کیونکہ دینی معارف اللہ تعالیٰ کے ثابت قوانین میں سے ہیں جن کو اللہ تعالیٰ اپنے خاص بندوں کے ذریعے سے ابلاغ کرتا ہے: ناجاھم فی فکرھم فی ذات عقولھم[10] یعنی: "وہ لوگ پروردگار کے ہم راز ہیں اور اللہ تعالیٰ ان کے ساتھ گفتگو کرتا ہے۔"۔ لہٰذا سب پر فرض ہے کہ اولیائے الٰہی کہ جو وحیِ ناطق بھی ہیں، کے ارشادات اور ثابت اصولوں کی جستجو کریں تا فروعات کا استخراج کر سکیں: علینا القاء الاصول الیکم وعلیکم التفرع[11] یعنی: "ہم پر لازم ہے کہ ہم اصولوں کو بیان کریں اور تم پر لازم ہے کہ ان اصولوں کے ذریعے سے فروعات کا استنباط کرو۔" یہاں جن اصول اور فروعات کی بات ہوئی ہے وہ کسی خاص تعلیمی شعبہ کے ساتھ مخصوص نہیں ہیں۔ جہاں ان کا تعلق فقہی اور شرعی احکام سے ہے، وہاں ان سے تمام انسانی اور سائنسی علوم بھی مراد ہیں۔

گذشتہ زمانے میں تمام علوم ایک ہی جگہ پر پڑھائے جاتے تھے۔ اس زمانے کے مدارس اور علمی مراکز میں فزکس بھی تدریس ہوتی تھی اور فلسفہ، کلام اور ریاضی بھی پڑھائی جاتی تھی۔ یہ تمام علوم ایک ہی جگہ پڑھائے جاتے تھے۔ لیکن تیسری صدی کے بعد علوم میں وسعت کی وجہ سے یہ ایک دوسرے سے جدا اور مستقل ہوئے۔[12] اس جدائی کو بہانا بنا کر دین دشمن طاقتوں نے دین کو محدود کرنے اور عقل کو معرفتِ دینی سے علیحدہ کرنے کی سازش کی اور عقل و حس کے توسط سے حاصل شدہ علوم کو سائنس کا نام دے کر اسے دین سے بالکل جدا قرار دے دیا۔ اس غلط تصویر و تصور کا نتیجہ یہ نکلا کہ کائنات بس مادہ اور مادے کے تحولات ہیں اور کوئی خالق و مخلوق نہیں ہے۔

علامہ جوادی آملی کے مطابق یہاں اس بنیادی ترین نکتہ کی طرف توجہ دی جائے کہ عقل، نقلی علوم کے مقابلے میں ہے نہ کہ دین کے مقابلے میں۔ اگر ہم دینی معرفت میں عقل اور نقل کو ایک جگہ قرار دیں تو علم و عقل کا دین کے ساتھ تعارض اور اختلاف کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ جس طرح نقلی دلائل کا دین کے ساتھ تعارض نہیں، بلکہ یہ دلائل خود دین کی شناخت کا منبع و سرچشمہ ہیں، اسی طرح عقل بھی دین کے ساتھ کسی قسم کے تعارض میں نہیں، بلکہ یہ شرعی حجت اور دین کی شناخت کا وسیلہ اور سرچشمہ ہے۔[13]

علم، عمل کے لئے

علامہ جوادی آملی کے مطابق تعلیم و تربیت کے بنیادی اصولوں میں سے پانچواں اصول، علم کو عمل کا مقدمہ قرار دینا اور علم پر عمل ہے۔ کیونکہ انسان ایک ایسی مخلوق ہے جو اپنے تمام اعمال، سوچ اور فکر کی بنیاد پر انجام دیتا ہے۔ اس کا تفکر اس کے کردار میں بہت اہمیت کا حامل ہے۔ نہ ہی اسے تفکر اور نہ ہی جدوجہد سے روکا جاسکتا ہے تاکہ وہ جامد اور غیر متحرک مخلوق بن جائے۔ اسی لئے سب انسان علم و عمل کا مجموعہ ہیں ان کا علم و دانش ان کی فعالیت میں مددگار ثابت ہوتا ہے۔[14] اگر علم و عمل کا آپس میں مناسب رابطہ نہ ہو تو یہ انسان درست تعلیم و تربیت نہیں پا سکتا۔ پس جتنا انسان کا علم عمیق اور کردار بہترین ہوگا اتنا ہی اس کے علم و عمل کے درمیان رابطہ بہترین ہوگا اور اسی قدر اس کی زندگی موثر اور نتیجہ خیز ہوگی اور ایسے شخص کو حقیقی طور پر زندہ کہا جائے گا۔ اسی لیے انبیاء اور پروردگار کے منتخب نمائندوں کا ہدف و مقصد احیائے انسانیت تھا: يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُواْ اسْتَجِيبُواْ لِلّهِ وَلِلرَّسُولِ إِذَا دَعَاكُم لِمَا يُحْيِيكُمْ (24:8) یعنی: " اے ایمان والو! اللہ اور رسول کو لبیک کہو جب وہ تمہیں حیات آفرین باتوں کی طرف بلائیں۔" اس آیت کی روشنی میں تعلیم و تربیت کا نتیجہ زندگی و حیات کی سوغات ہونی چاہیے اور کسی علم کے عالم کو ایسی کوئی تعلیم نہیں دینی چاہیے جو بنی نوع بشر کی حیات کو خطرے میں ڈال دے۔

عقل پروری

علامہ جوادی آملی کے مطابق تعلیم و تربیت کے بنیادی اصولوں میں سے چھٹا اہم اصول، عقل پروری ہے اور عقل کی پرورش اور تربیت کا تعلق، علم کے فروغ اور صالح عمل سے ہے۔ علم کے فروغ کا لازمی نتیجہ عقل پروری ہے تاہم آپ کے مطابق علم کی دو قسمیں ہیں : ۱) میزبان علم؛ ۲) مہمان علم۔ میزبان علم وہی ہے جسے پروردگار نے انسانوں کی فطرت میں ڈال دیا ہے: وَنَفْسٍ وَمَا سَوَّاهَا فَأَلْهَمَهَا فُجُورَهَا وَتَقْوَاهَا (8,7:91) ترجمہ: "اور نفس کی اور اس کی جس نے اسے معتدل کیا، پھر اس نفس کو اس کی بدکاری اور اس سے بچنے کی سمجھ دی۔" یہ علم ضائع نہیں ہوتا، سکھایا بھی نہیں جاتا ہے مادیات اور حیوانی شہوتوں کے غبار تلے دب جاتا اور کمزور پڑ جاتا ہے۔ مہمان علم، ایسا علم ہے جو سکولوں، یونیورسٹیوں اور مدرسوں میں پڑھایا جاتا ہے۔ یہ علم ہمیشہ نہیں رہتا جب انسان بوڑھا ہو جائے تو یہ علم بھول جاتا ہے۔ جیسے بہت سے دانشور بڑھاپے میں فراموشی کا شکار ہو جاتے ہیں لیکن علم میزبان ایسا علم ہے جو انسانی ضمیر میں ہدایت کے چراغ کی مانند ہے انبیاء نے انسانوں کے دلوں میں ایسے مہمانوں کو دعوت دی جو میزبان سے ہماہنگ تھے جنہوں نے چراغ کے نور کو مزید روشنی بخشی تاکہ عالم باعمل وجود میں آئیں۔ اگر پست مہان آجائے تو وہ اس نور کی روشنی کو کم کر دیتا ہے اور فطرت کو علم کے ساتھ ہمراہی سے روکتا ہے پھر ایسے شخص کی بصیرت تدریجا کم ہو جاتی ہے اور وہ مذہبی اجتماعات اور مراکز سے گریز کرنے لگتا ہے اور اللہ تعالیٰ کی نشانیوں کو بھی نہیں دیکھ پاتا: فِيهِ آيَاتٌ بَيِّنَاتٌ (97:3) ترجمہ: "اس میں واضح نشانیاں ہیں۔" پھر وہ تکبر میں مبتلا ہو جائے گا اور زمین و آسمان سمندروں اور پہاڑوں سے عبرت حاصل نہیں کر سکے گا۔

پس مہمان علم کو جلا بخشنا، دراصل عقل پروری ہے۔ وگرنہ انسان ہمیشہ نیکی اور حق کی طرف مائل ہوتا ہے۔ انسان فطری طور پر برا نہیں اور کسی کی برائی بھی نہیں چاہتا اس لیے کہ معارفِ الہیٰ سب کی فطرت میں موجود ہیں۔ بعض روایات میں آیا ہے کہ انسان پر نصیحت اثر نہیں کرتی جب تک وہ اندرونی طور پر نصیحت کو قبول نہ کرے یہ انسان کی فطرت ہے جو عقل نظری اور عقل عملی کا مجموعہ ہے۔[15]

انسانی کرامت

علامہ جوادی آملی کے مطابق تعلیم و تربیت کے بنیادی اصولوں میں سے ساتواں اہم اصول، انسانی کرامت کی حفاظت ہے۔ رسول اکرم ﷺ پر جو پہلی سورت نازل ہوئی وہ سورہ خلق ہے اس سورہ میں پروردگار کو اکرم کی صفت سے یاد کیا گیا ہے: اقْرَأْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِي خَلَقَ اقْرَأْ وَرَبُّكَ الْأَكْرَمُ (3,1:96) یعنی: "(اے رسول) پڑھیے! اپنے پروردگار کے نام سے جس نے خلق کیا۔ پڑھیے! اور آپ کا رب بڑا کریم ہے۔" اس آیت میں معلم

کو ایک خاص وصف سے ذکر کرنا، اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ اس کی تعلیم کا محور یہی صفت ہے خداوند اکرم قلم کے ذریعے سے کرامت کی تعلیم دیتا ہے اور انسان کو کریم بنا دیتا ہے۔ اللہ تعالی سب انسانوں کو کرامت کا درس دیتا ہے اور چاہتا ہے کہ سب لوگ کریم بن جائیں۔اس علم کے حصول کا ذریعہ فقط پڑھائی اور لکھائی نہیں ہے بلکہ اگر کوئی پڑھنا اور لکھنا نہ بھی جانتا ہو تو پروردگار اس کو دل اور روح کے ذریعے حقیقی معارف سکھا دیتا ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ انسانوں کا حقیقی معلم ہے۔پروردگار بعض انسانوں کو ظاہری تعلیم کے بغیر بھی کرامتِ انسانی سے شرفیاب فرماتا ہے۔ جیسے انبیائے کرام کو اور بعض لوگوں کو انبیاء کے ذریعے سے کرامت کے عالی مقام تک پہنچاتا ہے جیسا کہ پیغمبر اکرم ﷺ نے فرمایا: انما بعثت لاتمم مكارم الاخلاق[16] یعنی: "میں اس لئے مبعوث کیا گیا ہوں تا کہ مکارم اخلاق کو کمال تک پہنچاؤں۔"

اللہ تعالیٰ نے اپنے دین کو کریم کا عنوان دیا ہے، شریعت کے معلّمین اور اساتذہ کو بھی کریم کا لقب دیا ہے اور مکتب وحی کے شاگردوں کو بھی کرامت کی طرف دعوت دی ہے۔ وہ تمام چیزیں جو انسان کی تعلیم وتربیت کا محور ہیں انہیں کریم کا لقب دیا گیا ہے اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کو پیغام پہنچانے پر مامور فرمایا تو انہیں "عباد کریم" سے یاد کیا انبیا کرام جو انسانوں کے معلم ہیں انہیں بھی "کریم" کے لقب سے نوازا اور انبیاء کے صحیفوں کو "صحف مکرمہ" سے یاد فرمایا ہے اور دین کی اساس تقویٰ کو بھی "کرامت" کا سبب قرار دیا ہے۔[17] اس سے یہی نتیجہ نکلتا ہے کہ اگر ایک تعلیمی نظام انسان کو کرامت تک نہیں پہنچا سکتا تو جان لینا چاہئے کہ وہ نظام کامیاب نظام نہیں ہے۔

ایمان پروری

علامہ جوادی آملی کے مطابق تعلیم وتربیت کے بنیادی اصولوں میں سے آٹھواں اہم اصول، ایمان پروری ہے۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ علم ودانش کی ایمان کے ساتھ کوئی نسبت نہیں ہے۔ کیونکہ ان کے مطابق ایمان تعلیم سے نہیں، بلکہ تزکیہ سے حاصل ہوتا ہے۔علامہ جوادی آملی اس مدعا کو ردّ کرتے ہیں۔ان کے مطابق ایمان کی دو قسمیں ہیں: ۱)استدلالی ایمان؛ ۲) شہودی ایمان۔ شہودی ایمان، تہذیب اور تزکیہ کے ذریعے حاصل ہوتا ہے لیکن اس کا معنی یہ نہیں کہ انبیاء اور اولیاء کا ایمان، علم اور برہان سے خالی ہوتا ہے۔انبیاء نے ہمیشہ استدلالی ایمان پر زور دیا ہے اور استدلال کی بنیاد پر ایمان کی عمارت کھڑی کی ہے۔ پس اسلامی تعلیم وتربیت کا ہدف استدلالی ایمان پروری ہونا چاہیے۔مثال کے طور پر اگر ایک انسان کو یہ باور کروا دیا جائے کہ تمام موجودات عین ربط اور بارگاہ ربوبی میں محتاج محض ہیں تو وہ آسانی سے اس امر پر استدلال قائم کر سکتا ہے کہ پس خدا ہی تمام موجودات کی ضروریات کو پورا کر سکتا ہے۔یہ استدلال انسان کو وہ ایمان عطا کر سکتا ہے جس کی طرف قرآن کریم میں یوں

اشارہ ہوا ہے[18] : مَّا مِن دَآبَّةٍ إِلَّا هُوَ آخِذٌ بِنَاصِيَتِهَا إِنَّ رَبِّي عَلَى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيمٍ (56:11) یعنی: " میں نے اللہ پر بھروسہ کیا ہے جو میرا اور تمہارا رب ہے، کوئی جاندار ایسا نہیں جس کی پیشانی اللہ کی گرفت میں نہ ہو، بے شک میرا رب سیدھے راستے پر ہے۔"

*****

حوالہ جات

1۔ مجلّہ رشد معلم، (شمارہ11، 1983) 13۔

2 مجلّہ رشد معلم، 11۔

3۔ عبداللہ جوادی، آملی، *تسنیم*، ج7 (قم: انتشارات اسراء، 2005)، 491۔

4۔ عبداللہ جوادی آملی، *تسنیم*، ج7، 492۔

5۔ عبداللہ جوادی، آملی، *تسنیم*، ج7 (قم: انتشارات اسراء، 2005)، 505۔

6۔ روح اللہ، امام خمینیؒ، *کشف الاسرار*، ج1 (قم: انتشارات امام خمینی، ندارد)، 411۔

7۔ عبداللہ جوادی، آملی، *تسنیم*، ج6(قم: انتشارات اسراء، 2012)، 503۔

8۔ علامہ محمد باقر، مجلسی، بحار، ج2، ج83 (تہران: دار الکتب الاسلامیہ، ندارد)، 63، 18۔

9۔ عبداللہ جوادی، آملی، *شریعت در آینہ معرفت* (قم: انتشارات اسراء، 1993)، 166۔

10۔ سید محمد، رضی، *نہج البلاغہ*، (قم: ندارد، 2000)، 222۔

11۔ علامہ محمد باقر، مجلسی، *بحار الانوار*، جلد2 (تہران: دار الکتب الاسلامیہ، ندارد)، 245۔

12۔ عبداللہ جوادی، آملی، *منزلت عقل در ہندسہ معرفت دینی* (قم: انتشارات اسراء، 2007)، 108۔

13۔ عبداللہ جوادی آملی، *منزلت عقل در ہندسہ معرفت دینی*، 110۔

14۔ عبداللہ جوادی، آملی، *شکوفیی عقل در پرتو نہضت حسینی* (قم: انتشارات اسراء، 2007)، 118۔

15۔ عبداللہ جوادی، آملی، *شکوفایی عقل در پرتو نہضت حسینی* (قم: انتشارات اسراء، 2014)، 127۔

16۔ علامہ محمد باقر، مجلسی، *بحار الانوار*، ج16 (تہران: دار الکتب الاسلامیہ، ندارد)، 210۔

17۔ عبداللہ جوادی، آملی، *ہدایت در قرآن* (قم: انتشارات اسراء، 2016)، 136۔

18۔ عبداللہ جوادی، آملی، *شریعت در آئینہ معرفت* (قم: انتشارات اسراء، 1993)، 157۔

کتابیات

1) مجلّہ رشد معلم، (شمارہ11، 1983)۔
2) آملی، عبداللہ جوادی، *تسنیم*، ج7 ، قم، انتشارات اسرا، 2005۔
1) امام خمینیؒ، روح اللہ، *کشف الاسرار*، ج ا ، قم، انتشارات امام خمینی، ندارد۔
2) آملی عبداللہ جوادی، ، *تسنیم*، ج6، قم، انتشارات اسرا، 2012۔
3) مجلسی، علامہ محمد باقر، بحار، ج 2، ج83 ، تہران، دار الکتب الاسلامیہ، ندارد۔
4) آملی، عبداللہ جوادی، *شریعت درآینہ معرفت* ، قم، انتشارات اسرا، 1993۔
5) رضی، سید محمد، *نہج البلاغہ*، (قم: ندارد، 2000)، 222۔
6) مجلسی، علامہ محمد باقر، *بحار الانوار*، جلد2 (تہران: دار الکتب الاسلامیہ، ندارد)، 245۔
7) آملی، عبداللہ جوادی، *منزلت عقل در ہندسہ معرفت دینی*، قم، انتشارات اسرا، 2007۔
8) آملی، عبداللہ جوادی، *شکوفایی عقل در پرتو نہضت حسینی* (قم: انتشارات اسرا، 2007)، 118۔
9) آملی، عبداللہ جوادی، *ہدایت در قرآن* (قم: انتشارات اسرا، 2016)، 136۔

(اسلامی فقہ کی روشنی میں)

تعلیم وتربیت میں جسمانی سزا

CORPORAL PUNISHMENT IN EDUCATION

(From the viewpoint of Islamic Jurisprudence)

Ghulam Murtaza Ansari
Dr. Qaisar Abbas Jafari

Abstract:
Training is infact an activity performed by teacher or trainer to educate and nurture his pupal. In this field, an important responsibility of teachers and trainers is to flourish a sense of human dignity and moral values among their students. In order to reach this goal, all activities and tecniques of trainers must be conscious, logical and in line with the student's interest and ability. Unfortunatily, one of these tecniques have been corporal punishment. In this article, it has been observed whether the corporal punishment of students is right or wrong from the viewpoint of Islamic jurisprudence.
Keywords: *Corporal, Punishment, Education, Jurisprudence.*

خلاصہ
تربیت، استاد کا اپنے شاگرد کو تعلیم دینا اور اس کی اصلاح کرنا ہے۔ استاد اور والدین کی ایک اہم ذمہ داری یہی ہے کہ وہ اپنے بچوں کی انسانی کرامت اور ان کے اخلاق اور اقدار کی حفاظت کریں۔ اس ہدف تک پہنچنے کے لئے ان کا ہر قول و فعل آگاہانہ، منطقی اور شاگرد کے مفاد اور اس کی مصلحت کے مطابق ہونا چاہئے۔ وہ اس ہدف تک پہنچنے کے لئے جو طور و طریقے اپنا سکتے ہیں ان میں ایک طریقہ، جسمانی سزا ہے۔ اس مقالہ میں یہ دیکھا گیا ہے کہ آیا شاگرد پروری میں جسمانی سزا کی روش فقہی لحاظ درست ہے یا نہیں؟ اس مقالہ میں استاد یا مربی کی ذمہ داریوں اور اس کے اختیارات کا بھی جائزہ لیا گیا ہے۔
کلیدی الفاظ: جسمانی، سزا، تعلیم، فقہ۔

تعارف

بچوں کی جسمانی سزا ایک ایسا مسئلہ ہے جس میں ہر معاشرہ خواہ اسلامی معاشرہ ہو یا غیر اسلامی، مبتلا ہے۔ والدین اور اساتذہ جسمانی سزا کے ذریعے بچوں کی نازیبا حرکات روکنے کی کوشش کرتے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ آیا تعلیم و تربیت میں جسمانی سزا فقہی لحاظ سے جائز ہے یا نہیں؟ اس سوال کے ذیل میں اور بھی کئی سوالات پیدا ہوتے ہیں۔ مثال کے طور پر آیا جسمانی سزا، تربیت کا ذریعہ ہے بھی یا نہیں؟ اگر جسمانی سزا، تربیت کا ذریعہ ہے تو اس کی شرائط، اصول اور معیار کیا ہیں؟ بچوں کی کن غلطیوں پر انہیں جسمانی سزا دی جا سکتی ہے اور سزا کی آخری حد کیا ہے؟ اور جسمانی سزا دینے کا حق کسے حاصل ہے؟ وغیرہ وغیرہ۔ ان سوالات کے جواب میں ماہرین نفسیات کہتے ہیں کہ کسی بھی صورت میں بچوں کو جسمانی سزا دینا جائز نہیں ہے۔ کیونکہ اس کے بہت سارے منفی اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ اس کے برعکس، اکثر اسلامی دانشمندوں، علماء اور مجتہدین کا نظریہ ہے کہ اسلامی نقطۂ نگاہ سے خاص شرائط اور حدود کے ساتھ بچوں کو جسمانی سزا دی جا سکتی ہے۔ بہر صورت، یہ موضوع بہت ہی اہمیت کا حامل ہے۔ لہٰذا اس مقالہ میں ہم نے فقہی لحاظ سے اس موضوع پر بحث مندرجہ سوالات کے ذیل پیش کریں گے تاکہ اساتذہ اور والدین کو بچوں کی تربیت میں اپنی ذمہ داریوں کا احساس دلاتے ہوئے موضوع کی شرعی حدود معین کر سکیں۔ امید ہے یہ تحریر تعلیم وتربیت اور شاگرپروری کے شعبہ سے مربوط افراد کے لئے ایک راہنما تحریر ثابت ہو گی۔

تربیت کا مفہوم

لغت میں تربیت پرورش کرنے اور کسی بھی کام کو ثمر بخش بنانے کا نام ہے۔[1] عام طور پر نابالغ بچوں کی تعلیم، ان کی ہدایت اور اخلاق سازی کو تربیت کا نام دیا جاتا ہے۔[2] اصطلاح میں تربیت ایسے تدابیر اور طور و طریقے کا مجموعہ ہے جو انسانی زندگی کے مختلف پہلوؤں کو بروئے کار لانے کے لئے اپنایا جاتا ہے۔ اس تعریف کے پیش نظر مربی یا تربیت کرنے والے کے لئے ضروری ہے کہ شاگرد کی زندگی کے مختلف پہلوؤں سے باخبر ہو تاکہ وہ انسانی فطرت کے مطابق تدریجاً اور قدم بہ قدم اس کی تربیت کر سکے۔[3] اس حوالے سے استاد اعرافی مدظلہ فرماتے ہیں: "تربیت تغییرات تدریجی کا وہ مجموعہ ہے جو ایک مدت تک انسان اپنی حرکت مبداء سے مقصد کی طرف شروع کرتا ہے۔"[4] لہٰذا اسلامی قوانین کی رو سے بچوں کی تربیت میں گاہے گاہے جسمانی سزا کی اجازت بھی اس غرض کے تحت دی گئی ہے تاکہ بچے مختلف جرائم کے مرتکب نہ ہوں، وگرنہ بڑے ہو کر وہ بھیانک جرائم کے مرتکب ہو سکتے ہیں۔

سزا کی اقسام

اسلامی تعلیمات میں سزاوں کی مختلف اقسام ہیں۔ ان میں ایک قسم "**تنبیہ**" ہے جس کا لفظی معنی بیدار کرنا، کسی چیز کی اطلاع دینا اور آگاہ کرنا ہے۔[5] اصطلاح میں تنبیہ اس عمل یا فعل کو کہا جاتا ہے جس کا لازمہ دوسرے کو آگاہ کرنا یا ہوشیار کرنا ہو۔ ویر کہتے ہیں کہ تنبیہ اس وقت واقع ہوتی ہے کہ جب کسی کو اچھا اور مثبت جواب کی بجائے منفی جواب دے۔ سادہ الفاظ میں تنبیہ اسے کہا جاتا ہے جو کسی ایسی چیز کو انسان سے دور کرے کہ جس کی طرف وہ زیادہ مائل ہو، اور کوئی ایسی چیز اسے دے دی جائے جس سے اسے زیادہ نفرت ہو۔[6] جان لیانز اور اس کے ساتھی کہتے ہیں: تنبیہ بچے کا کسی کام کے انجام دینے کے فوراً بعد ایک ناخوشایند فعل کا انجام دینا یا اچھے فعل کا حذف کرنا ہے۔ مثال کے طور پر بُرے الفاظ بولنا یا طمانچہ رسید کرنا جسے **تنبیہ خاص** کہا جاتا ہے۔[7] لیکن اس کے مقابلے میں **تنبیہ عام** یہ ہے کہ جب بچہ کوئی بُرا کام انجام دے تو اس سے ناراضگی کا اظہار کرنا، تجاہل عارفانہ، بے اعتنائی، تحقیر، تہدید، مذاق اڑانا، اس کی پسندیدہ چیز سے محروم کرنا، جرمانہ عائد کرنا، منہ موڑ لینا، گھورنا وغیرہ۔ اس کے علاوہ، **تنبیہ اخص** سے مراد صرف مار پیٹ اور جسمانی سزا دینا ہے۔

سزا کی ایک قسم، "**تأدیب**" ہے۔ "تأدیب" مصدر ہے "ادب" کا: "الادب، الذی یتأدب بہ الادیب من الناس سمی ادب لانہ یادب الی المحامد و ینھاھم عن المقابح۔[8] یعنی: "ادب نیک انسان اپنے اخلاق اور رفتار کو اس قالب میں ڈال دیتا ہے، یا وہ چیز ہے جو ادیب لوگ دوسروں کو سکھاتے ہیں۔ اسی لئے اسے ادیب کہا جاتا ہے کہ وہ دوسروں کو اچھی خصلت اور نیک رفتار کی طرف دعوت دیتا ہے اور بُری خصلتوں سے روکتا ہے۔[9] اسی لئے اگر کسی کو بُرے عمل کی وجہ سے مجازات یا سزا دی جائے تو اسے کہا جاتا ہے اس کی "تأدیب" ہوئی ہے، کیونکہ یہی سزا اس شخص کا ادب اور نیک عمل، اچھے اخلاق کا اپنانے اور بُرے فعل سے دُوری اختیار کرنے کا سبب بنتی ہے۔[10] تأدیب کا دوسرا معنی: "تأدیب الادب" ہے جس سے مراد ہر وہ عمل جو دوسروں کے اچھے اخلاق اور نیک سیرت کی طرف آنے کا سبب بنتا ہے۔[11] اس تعریف کی رو سے "تأدیب" بالکل "تعلیم وتربیت" کے مترادف ہوگی۔ یہی وجہ ہے بعض فقہاء نے اپنی کتابوں کا نام ادب کے مشتقات پر رکھا ہے۔ جیسے: مرحوم نصیرالدین طوسی کی کتاب "آداب المتعلمین"۔[12] سزا کی اقسام میں سے ایک اور قسم "**حدّ**" ہے۔ فقہی اصطلاح میں "حدّ" اس سزا کو کہا جاتا ہے جس کا حکم اور مقدار، دونوں شریعت میں بیان ہوئے ہوں۔ اس کے مقابلے میں "**تعزیر**" ایسی سزا کا نام ہے جس کا شریعت میں حکم تو ہو لیکن اس کی کوئی خاص مقدار بیان نہ ہوئی ہو۔ مرحوم شہید ثانی[13] اور صاحب جواہر[14] فرماتے ہیں: ہر وہ گناہ جن کے لئے سزا اور مجازات معین ہو اسے "حد" کہا جاتا ہے اور وہ ہر وہ گناہ جس کے لئے کوئی

"حد" معین نہ کی گئ ہو اسے تعزیر کہا جاتا ہے۔ سزا کی ایک قسم، "**انذار**" بھی ہے جس کا معنی کسی برے عمل یا گناہ کے مرتکب ہونے پر جو بُرے اثرات مترتب ہوتے ہیں ان سے لوگوں کو آگاہ کرنا ہے تاکہ لوگوں کو ایسے عمل کے ارتکاب سے روکا جاسکے۔ انذار کے لئے بھی کچھ شرائط ہیں:

1- سب سے پہلی شرط یہ ہے کہ اس میں ایک قسم کی خبر دے رہا ہو۔

2- ایک خوفناک اور خطرناک کام کی خبر دے رہا ہو، یعنی اس میں خوف پیدا ہو۔

3- انسان کے اختیاری فعل کے بارے میں خبر دے رہا ہو۔

4- ایسی خبر جو بچوں میں غور و فکر کی ترغیب دلا رہا ہو، اور یہی انذار کی تربیتی پہلو ہے۔

نفسیاتی اور جسمانی سزا

سزا کو بنیادی طور پر دو قسموں میں تقسیم کیا جاتا ہے: (۱) نفسیاتی سزا (۲) جسمانی سزا۔ نفسیاتی سزا بذات خود دو قسموں یعنی "زبانی" اور "عملی" میں تقسیم ہوتی ہے۔ اس سے اگلی تقسیم میں زبان کے ذریعے "**نفسیاتی سزا**" کی مزید تین قسموں میں تقسیم ہوتی ہے: ۱) **کنایہ:** جس میں معلم یا والدین اپنے بیان میں اشارہ کنایہ کے ذریعے بچے کی رہنمائی کرتے ہیں، تاکہ وہ اپنی غلطیوں سے آگاہی حاصل کرتے ہوئے انہیں ترک کرسکے کیونکہ اکثر اوقات دوسروں کے سامنے صراحت کے ساتھ اس کی غلطیاں بتانے سے بچہ اصلاح کی بجائے بگاڑ کا شکار ہو کر مزید خراب ہو جاتا ہے اور اس میں بے ادبی اور تخریب کاری بڑھ جاتی ہے۔ اس لئے ابتدائی مرحلہ میں اشارہ اور کنایہ کے ذریعے اس کو متنبہ کیا جائے، جیساکہ معصومؑ کا فرمان ہے: الکنایة أبلغ من التصریح۔[15] یعنی: "کنایہ، تصریح سے زیادہ رسا ہوتا ہے۔" ۲) **ملامت** : معمولاً ملامت کسی نامطلوب فعل کے انجام دینے کے بعد اس کے بُرے نتائج سے آگاہ کرنا ہے۔ لیکن اس سلسلے میں زیادہ روی نہیں کرنا چاہئے کیونکہ ممکن ہے اس کا نتیجہ برعکس نکلے، جیسا کہ حضرت علیؑ نے فرمایا: وَ الْإِفْرَاطُ فِي الْمَلَامَةِ يَشُبُّ نِيرَانَ اللَّجَاجِ[16] یعنی: "ملامت کرنے میں اگر زیادہ روی سے کام لیا گیا تو لجاجت کی آگ مزید شعلہ ور ہوگی۔" ۳) **تہدید** : تہدید میں متربی کو اس کے غلط کردار کے بُرے نتائج اور اس کے مجازات سے آگاہ کیا جاتا ہے اور اس تہدید کی بھی دو قسمیں ہیں: الف) غیر مستقیم تہدید؛ جیساکہ قرآن کریم میں کئ آیات میں عذاب کے بارے میں غیر مستقیم تہدید بیان کی گئ ہے۔ ب) مستقیم تہدید جس میں واشگاف الفاظ میں سزا کی دھمکی دی جاتی ہے۔ مثال کے طور پر کسی کو یہ کہنا کہ: لَوِ انْتَهَيْتَ وَإِلَّا ضَرَبْتُكَ یعنی: "اگر تم نہ رکے تو میں تمہیں ماروں گا۔"

جہاں تک زبان کے ذریعے "**عملی سزا**" کا تعلق ہے تو اس کی عمدہ دو قسمیں ہیں: ۱) **اظہارِ ناراضگی**: بچے کو صحیح راستہ پر لانے اور بُرے عمل سے روکنے کا ایک بہترین طریقہ صحیح اور مناسب موقع پر ناراضگی کا اظہار ہے۔ ناراضگی کا ایک نمونہ تیور Body Language ہے۔ مثال کے طور پر مربی یا والدین منہ پر تیوری چڑھا کر شاگرد کو سزا دیتے ہیں۔ اسی طرح جدائی اختیار کرنا بھی ناراضگی کا ایک مصداق ہے کہ جس کے بارے میں ارشاد باری تعالیٰ ہے: وَ اصْبِرْ عَلٰی ما یَقُولُونَ وَ اهْجُرْهُمْ هَجْراً جَمِیلا۔(10:73) یعنی: "اور جو کچھ یہ لوگ کہہ رہے ہیں اس پر صبر کیجیے اور شائستہ انداز میں ان سے دوری اختیار کیجیے۔" عموماً ناراضگی کا اظہار کبھی بات نہ کرکے تو کبھی غصے سے دیکھ کر کیا جاتا ہے لیکن اس مقام پر بھی یاد رہے قہر یا ناراضگی کا اظہار ضد اور غم وغصے کی وجہ سے نہیں بلکہ صرف تربیتی پہلو کو مدّنظر رکھ کر انجام دیا جانا چاہئے۔ ۲) **جرمانہ**: ناشائستہ رفتار انجام دینے کی صورت میں تنبیہ کرنے کا ایک طریقہ جرمانہ کرنا ہے۔ اگر بچہ سکول کا کام انجام نہیں دیتا ہے تو استاد اسے جرمانہ کرکے اس سے کام لے سکتا ہے۔ لیکن جرمانہ کیا ہو؟ بہتر یہ ہے، کہ جرمانہ اس کے فائدے میں ہو، جیسے بطور سزا کچھ زیادہ ہوم ورک دے دیا جائے وغیرہ۔ اسی طرح بچے کو اس کی پسندیدہ چیز سے محروم کرنا بھی ایک طرح کا جرمانہ ہے۔ بطور مثال بچہ کھیل کود اور کھانے پینے کا بہت شوقین ہوتا ہے جب سزا کے طور پر اسے کھانے پینے یا کھیل کود سے دُور رکھا جائے تو وہ اس ناپسندیدہ عمل کو اس لئے ترک کرے گا کہ اسے دوبارہ وہ پسندیدہ کھانا اور کھیل کود کا موقع دیا جائے۔البتہ ماہرین کے مطابق محروم سازی میں بھی بچہ کی عمر، ادراک، صبر وتحمل وغیرہ کا ضرور خیال رکھا جانا چاہئے ورنہ ممکن ہے یہ محروم سازی بچہ کے دل میں بغض وکینہ کا سبب بنے۔

ترتیب کے لحاظ سے سزاوں میں سب سے آخری مرحلہ پر "**جسمانی سزا**" ہے جس کی عام طور پر دو قسمیں بیان کی جاتی ہیں۔ ۱) **مجازات**: یہ سزا مار پیٹ کے ذریعے انجام پاتی ہے۔ جب تک سزا کی اخلاقی اقسام مفید و موثر ہوں تو اس سزا سے گریز کرنا ضروری ہے۔ لیکن جب ان میں سے کوئی ایک بھی کارساز نہ ہو تو اس وقت اس سزا کا سہارا لیا جاتا ہے۔ اس قسم کی سزا کا مقصد بھی سزا دینا نہیں، بلکہ تربیت کرنا ہے۔ اس کی بہت سی شرائط ہیں جن کا بعد میں تذکرہ ہوگا۔ ۲) **تسکین**: کبھی استاد یا والدین بچوں کو اپنی قلبی تسکین یا انتقام کے لئے جسمانی سزا دیتے ہیں۔ یہ سراسر غلط ہے۔ بچے کو سزا اس کی تربیت یا کردار کی اصلاح کے لئے دینا چاہئے، کیونکہ اگر شاگرد سمجھ جائے کہ استاد نے اپنی دلی تسکین اور انتقام کے لئے اسے مارا ہے تو اس وقت شاگرد میں شرارت اور لجاجت اور بڑھ جائے گی اور وہ مزید بگڑ جائے گا۔

آراء و نظریات

جسمانی سزا کے بارے میں مختلف آراء و نظریات پائے جاتے ہیں۔ کلی طور پر تین نظریات قابل نقد و تبصرہ ہیں: الف)**افراطی نظریہ**: پرانے زمانے کے تربیتی مکاتب کا نظریہ یہ تھا کہ شاگرد جو زیادہ ذہین اور سالم طبیعت کے مالک نہ ہونے کی وجہ سے سخت ترین جسمانی سزا کے بغیر صحیح لائن میں نہیں آتے تھے۔ کچھ لوگ کہتے ہیں کہ جب شاگرد کسی ناروا کام میں مصروف ہو جاتے ہیں تو ان میں شیطانی روح داخل ہوتی ہے اور شیطان جوانوں اور نوجوانوں کے اندر حلول کر جاتا ہے اس لئے ان کی صحیح پٹائی کی ضرورت پڑتی ہے، اور ان کو تنگ و تاریک مقامات پر قید کرتے تھے تاکہ شیطان ان کے بدن سے نکل جائے۔ ب) **تفریطی نظریہ**: اس نظریہ کے پیروکار کہتے ہیں کہ کسی بھی صورت میں جسمانی سزا نہیں دینی چاہئے۔ ان کا عقیدہ ہے بچوں اور نوجوانوں کے نامناسب افعال کو تحمل کرے اور ان کو بیمار کی مانند سمجھنا چاہئے۔ روسو، فروبل اور پستالوزی کا عقیدہ ہے کہ ہر صورت میں تنبیہ بچوں پر بُرے آثار چھوڑتی ہے۔ ج) **معتدل نظریہ** : ایک گروہ کا نظریہ ہے کہ تشویق و ترغیب کو ہر صورت میں سزا پر ترجیح حاصل ہے لیکن سزا کا تصور بھی عقل سلیم سے بالکل ہمآہنگ ہے۔ البتہ سزا دینے میں افراط سے پرہیز کیا جائے اور شاگردوں یا بچوں کی تحقیر اور تذلیل نہ کی جائے۔

ابتدائی قاعدہ

امامیہ فقہاء اور مجتہدین کے مطابق بچوں بچوں کو سزا دینے میں ابتدائی قاعدہ یہ ہے کہ یہ جائز نہیں۔ اس مدعا پر کئی دلیلیں پیش کی گئی ہیں: منجملہ "رفع القلم" کا قاعدہ جس کا سرچشمہ رسول خداؐ کا یہ فرمان کہ: " تین گروہ سے تکلیف ساقط ہے اور ان پر کوئی مؤاخذہ نہیں کیا جائے گا: بچہ جو ابھی حد بلوغ کو نہیں پہنچا۔ پاگل جو ابھی تک صحیح نہیں ہوا اور وہ شخص جو سو رہا ہے یا بے ہوش ہے۔" [17]اس مدعا پر دوسری دلیل "ایذاء کی حرمت" کا قاعدہ ہے جس کے مطابق اسلامی شریعت میں دوسروں کو کسی قسم کی اذیت وآزار پہنچانا حرام ہے۔ یہ حکم مطلق ہے اور اس کا اطلاق، جسمانی اور روحانی ہر قسم کی اذیت وآزار اور سزا پر ہوتا ہے۔ امام صادقؑ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالی کا فرمان ہے جس نے بھی میرے کسی مؤمن بندے کو اذیت دی گویا اس نے میرے ساتھ اعلان جنگ کیا ہے۔ اور جس نے بھی میرے مؤمن بندے کا احترام کیا وہ میرے غضب سے محفوظ رہا، اور اگر روئے زمین پر مشرق سے مغرب تک میں میری مخلوقات میں سے کوئی نہ ہو سوائے ایک مؤمن بندہ اور اس کا عادل امام کے، تو میں ان دونوں کی عبادت اور بندگی کی وجہ سے باقی تمام مخلوقات کی عبادتوں سے بے نیاز ہوں گا۔ اور سات آسمان اور زمین ان دونوں کی برکت سے قائم رہیں گے، اور ان کے لئے ان کے اپنے ایمان میں سے ایسا مؤنس و غمخوار پیدا کروں گا، جس کے علاوہ کسی اور کی انس و محبت کی طرف محتاج نہیں ہوں گے۔ [18] یہ روایت صحیحہ ہے کیونکہ اس

کے سارے راوی محمد بن یعقوب، محمد بن یحیٰ العطار، احمد بن محمد بن عیسی الاشعری، الحسن بن محبوب سراد اور ہشام بن سالم، سب ثقہ ہیں۔[19]

اس مدعا پر تیسری دلیل "حرمتِ ضرار" کا فقہی قاعدہ ہے۔اس قاعدہ کے مطابق کسی کو بھی حق نہیں کہ دوسرے کو ضرر پہنچائے۔ یہ قاعدہ عام ہے جو جسمانی سزا کو بھی شامل ہے۔اور اس قاعدہ کا اطلاق بچوں کو روحانی یا جسمانی سزا دینے پر ہوتا ہے۔ مدعا پر چوتھی دلیل یہ ہے کہ از روئے عقل، جسمانی سزا، انسانی حریت اور آزادی سے منافات رکھتی ہے۔اسلامی تعلیمات کی روشنی میں ہر انسان حریت اور آزادی رکھتا ہے اور اسے اس کے اعمال پر سزا دینا، انسانی آزادی سے منافات رکھتا ہے۔ کیونکہ کسی کو کسی پر مسلط نہیں کیا جا سکتا۔اسی طرح سزا ایک طرح کا ظلم ہے جس سے شریعت میں روکا گیا ہے۔پس جسمانی سزا، از روئے عقل بھی جائز نہیں ہے۔پس فقہاء اور مجتہدین امامیہ کے مطابق بچوں کو سزا دینے میں ابتدائی قاعدہ یہ ہے کہ یہ جائز نہیں ہے۔

ثانوی قاعدہ

یہاں سوال یہ اٹھتا ہے کہ آیا بچوں کو سزا دینے کا عدمِ جواز مطلق ہے یا تعلیم وتربیت کی غرض سے بچوں کو سزا دی جا سکتی ہے اور ابتدائی قاعدہ کی جگہ ثانوی قاعدہ لاگو کیا جا سکتا ہے؟اس سوال کے جواب میں کئی امامیہ فقہاء ثانوی قاعدہ کے بقدر ضرورت جواز کے قائل ہوئے ہیں۔ مثال کے طور پر محقق نجم الدین جعفر بن حسن حلی فرماتے ہیں: غلام کو ۱۰ کوڑے سے زیادہ مارنا مکروہ ہے۔اور اگر دس سے زیادہ مارے تو اسے آزاد کرنا مستحب ہے۔[20] شیخ طوسی نے اس بارے میں لکھا ہے: فقہاء کا اجماع ہے کہ معلم نابالغ بچہ کو اس کی تأدیب کی خاطر مار سکتا ہے۔[21] صاحب مختصر النافع فرماتے ہیں کہ بچے کو ادب سکھانے کے لئے ۱۰ کوڑے سے زیادہ مارنا مکروہ ہے۔جس طرح غلام کو ۱۰ کوڑے سے زیادہ مارنا مکروہ ہے: (الرابعة) يكره أن يزاد في تأديب الصبي عن عشرة أسواط وكذا العبد، ولو فعل استحب عتقه[22] آیۃ اللہ خوئی نے تکملہ المنھاج کے مبانی میں فرمایا ہے: لا باس بضرب الصبي تأديبا خمسه او سته مع رفق هذا في غير المعلم و اما فيه فالظاهر عدم جواز الضرب بازيد من ثلاثة۔ یعنی: "غیر معلم کے لئے بچے پر ۵ سے ٦ ضرب جو ملائم اور ہلکی ہو، کوئی اشکال نہیں ہے، لیکن معلم یا استاد کو تین ضرب سے زیادہ مارنا جائز نہیں ہے۔" اہل سنت کی معروف کتاب [الفقہ علی المذاہب الخمسة] میں بچوں کی جسمانی سزا کو جائز قرار دیتے ہوئے کہتے ہیں: "اگر کوئی بچہ کسی کو قتل یا زخمی کرے، تو اس کا حکم بھی پاگل کے حکم جیسا ہے، یعنی اس بچہ سے قصاص نہیں لیا جائے گا کیونکہ اس پر دنیا اور آخرت دونوں میں کوئی

عذاب نہیں ہوگا، جیساکہ حدیث میں آیا ہے کہ : عمد الصبی خطاء۔ لہذا بچہ پر قصاص تو نہیں لیکن ادب سکھانے کی خاطر جسمانی سزا دے سکتا ہے۔"[23]

دلائل

اگر یہ پوچھا جائے کہ جو فقہاء قاعدہ ثانویہ کے طور پر بچوں کی جسمانی سزا کے جواز کے قائل ہوئے ہیں، ان کی دلیل کیا ہے تو جواب یہ ہے کہ ان فقہاء کے مطابق ان کے مدعا پر سب سے پہلی دلیل خود قرآن کریم کی آیات ہیں۔ ارشاد باری تعالی ہے: یَآاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا قُوْٓا اَنْفُسَكُمْ وَاَهْلِیْكُمْ نَارًا وَّقُوْدُهَا النَّاسُ وَالْحِجَارَةُ عَلَیْهَا مَلٰٓئِكَةٌ غِلَاظٌ شِدَادٌ لَّا یَعْصُوْنَ اللّٰهَ مَآ اَمَرَهُمْ وَیَفْعَلُوْنَ مَا یُؤْمَرُوْنَ(6:66) یعنی: "اے ایمان والو! اپنے آپ کو اور اپنے اہل و عیال کو اس آگ سے بچاؤ جس کا ایندھن انسان اور پتھر ہوں گے، اس پر تندخو اور سخت مزاج فرشتے مقرر ہیں جو اللہ کے حکم کی نافرمانی نہیں کرتے اور جو حکم انہیں ملتا ہے اسے بجالاتے ہیں۔" اس آیت میں اپنے اہل و عیال کو جہنم کی آگ سے بچانے کا مطلق حکم آیا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ انسان اپنے اہل و عیال کو ہر ممکن وسیلے سے جہنم کی آگ سے بچائے چاہے اس غرض سے انہیں جسمانی سزا بھی کیوں نہ دینا پڑے۔ بنابریں، اس آیات سے بچوں کی جسمانی سزا کا جواز ثابت کیا گیا ہے۔ اسی طرح قرآن کریم کی لگ بھگ ۶۰۰ آیات میں نے اللہ کی نافرمانی کرنے والوں کو دنیوی اور اخروی سزا کا حکم سنایا یا ہے۔ قرآن کریم میں جن سزاوں کا حکم سنایا گیا ہے ان کی عمدہ تین اقسام ہیں:

الف) **<u>جرم وجنایت پر سزا</u>** : قرآن کریم نے آیات الاحکام میں بعض جرائم پر سزا حد یا تعزیر کی صورت میں معین کی ہے۔ جیسے زانی مرد اور عورت کے بارے میں فرمایا: "زناکار عورت اور زناکار مرد دونوں کو ایک سو کوڑے مارو اور دین خدا کے معاملے میں تمہیں ان پر ترس نہیں آنا چاہیے اگر تم اللہ اور روز آخرت پر ایمان رکھتے ہو اور ان کی سزا کے وقت مؤمنین کی ایک جماعت موجود رہے۔" (2:24) اسی طرح تہمت لگانے والوں کے لئے بھی قرآن کریم میں سزا معین فرمائی گئی ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے: "اور جو لوگ پاک دامن عورتوں پر بدکاری کی تہمت لگائیں پھر اس پر چار گواہ نہ لائیں پس انہیں اسّی (۸۰) کوڑے مارو اور ان کی گواہی ہر گز قبول نہ کرو اور یہی فاسق لوگ ہیں۔" (4:24) اسی طرح چوری کرنے والے کے ہاتھ کاٹنے کا حکم بھی آیات الاحکام میں سے ہے جو جسمانی سزا ہے۔

ب) **<u>مکافات عمل</u>**: بہت سی آیات، گذشتہ اقوام کی سزا کو ان کے اعمال کا نتیجہ قرار دیتی ہیں۔ جیسے اصحاب سبت کی سزا۔ (56:2)، (163:7 تا 167)، قوم بنی اسرائیل کی سزا(59:2،65،66)،(278:5) اور ابلیس کی سزا (18:7،13)،(44:15،35،34،29) کہ جسے درگاہ الٰہی سے نکال دیا گیا۔

ج) **تأدیب**: کچھ آیات ، لوگوں کی تأدیب، تربیت اور اصلاح کے لئے سزا کو ضروری قرار دیتی ہیں۔ مثال کے طور پر ان لوگوں کی سزا جنہوں نے رسول خداؐ کے فرمان کی مخالفت کرتے ہوئے جنگ میں جانے سے انکار کیا۔ مرارۃ بن ربیع ، ہلال بن امیہ اور کعب بن مالک وہ لوگ تھے جو جنگی مشکلات اور سختیوں کو برداشت نہ کرپائے اور جنگ میں جانے سے انکار کر دیا تو سزا کے مستحق قرار پائے۔ لیکن بعد میں پشیمان ہو کر توبہ کی اور رسول خدا سے عذر خواہی کی تو آپ نے ان کو معاف کر دیا۔ اسی طرح جو لوگ غزوہ تبوک میں پیچھے رہ گئے توزمیں اپنی وسعت کے باوجود ان پر تنگ ہو گئی اور اُن پر خود ان کی اپنی جانیں دوبھر ہو گئیں ۔[24] یہ سزائیں ان لوگوں کی تادیب اور ااصلاح کے لئے تجویز ہوئیں جو رسول اکرم ﷺ کی نافرمانی کے مرتکب ہوئے۔ اسی طرح سورہ نساء میں اپنے شوہروں کی نافرمانی کرنے والی عورتوں کی اصلاح کے لئے تین قسم کی سزا تجویز ہوئی ہے: "اور جن عورتوں کی سرکشی کا تمہیں خوف ہو انہیں نصیحت کرو (اگر باز نہ آئیں تو) خواب گاہ الگ کر دو اور (پھر بھی باز نہ آئیں تو) انہیں مارو، پھر اگر وہ تمہاری فرمانبردار ہو جائیں تو ان کے خلاف بہانہ تلاش نہ کرو، یقیناً اللہ بالاتر اور بڑا ہے۔" (24:4) علامہ طباطبائی معتقد ہیں کہ یہ تین آیتیں اصلاح اور تربیت پر دلالت کرتی ہیں ۔[25] ان آیات کی روشنی میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ بچوں کی تعلیم وتربیت اور اصلاح کے لئے سزا دینا جائز ہے۔

بعض روایات سے بھی بچوں پر بعض سزائیں جاری کرنے کا جواز ثابت ہوتا ہے۔ صحیحہ حلبی میں امام صادقؑ سے منقول ہے کہ امیرالمؤمنینؑ کا فرمان ہے کہ حدود کے اجراء کرتے وقت رسی یا کوڑے کے درمیاں سے پکڑے یا کچھ حصہ پکڑے اور مارے، کیونکہ مجرم نابالغ بچہ اور غلام ہونے کی وجہ سے اللہ تعالی کا حکم ملتوی نہیں کرسکتا۔ کسی نے عرض کیا: کیسے مارا جائے؟ آپ نے فرمایا: رسی کو درمیاں سے پکڑے یا تیسرا حصہ پکڑے اور پھر اس کے عمر کے حساب سے مارے اور اللہ کے معین کردہ حدود باطل نہیں ہو سکتیں۔ ایسے موارد میں تأدیب کی مقدار اس کے سن و سال کے مطابق اور حاکم شرع کے صواب دید پر معین ہوگی۔[26] معتبرۂ یزید کناس میں امام باقرؑ سے نقل ہوا ہے کہ جو بچہ ابھی حد بلوغ کو نہیں پہنچا ہے اگرچہ اس کے والدین نے اس کی شادی بھی کرادی ہو اس پر حد جاری ہو گی اور اسے اس کی عمر کے حساب سے کوڑا مارا جائے گا۔ یعنی ۱۵سال پورا ہونے تک کامل حد تو جاری نہیں کرسکتا جو بڑوں کے اوپر جاری کیا جاتا ہے، بلکہ حاکم شرع کی مرضی کے مطابق اسے سزا دی جائے گی۔ لیکن بہر صورت اللہ تعالی کا قانون نہیں بدل سکتا اور نہ مسلمانوں کا ایک دوسرے پر موجود حقوق ضائع کیا جاسکتا ہے۔[27]

راوی کہتا ہے کہ میں نے امام صادقؑ کی خدمت میں عرض کیا: بعض اوقات میں اپنے غلام کو جرم کا مرتکب ہونے پر مارتا ہوں۔ آپ نے پوچھا: کتنا مارتے ہو؟ عرض کیا: کبھی ۱۰۰ ضرب مارتا ہوں۔ حضرت نے تعجب کے

ساتھ فرمایا: ۱۰۰ ضرب ؟! کیا تم زنا کی حد جاری کرتے ہو ؟ خدا کا خوف کرو۔ میں نے عرض کیا: مولا! میں آپ پر قربان جاؤں ! کتنا ماروں تو مناسب ہے؟ آپ نے فرمایا: ایک ضربہ مارو۔ عرض کیا: خدا کی قسم! اگر اسے پتہ چلے کہ میں صرف ایک ضربہ مارنے والا ہوں تو وہ میرے لئے کچھ بھی باقی نہیں رکھے گا۔ حضرت نے فرمایا: پس دو ضربہ مارو۔ عرض کیا: یہ بھی میری ہلاکت کا باعث ہے۔ امام نے اور اصرار فرمایا یہاں تک کہ پانچ مرتبہ تکرار کرتے ہوئے غضبناک حالت میں فرمایا: اے اسحاق! اگر اس کا جرم حد کا مستحق ہو تو اس پر حد جاری کرو لیکن حدود الٰہی سے تجاوز نہ کرو۔[28] اسی طرح ایک اور روایت میں راوی کہتا ہے کہ میں نے امام صادقؑ کی خدمت میں بچوں اور غلاموں کی تنبیہ اور تأدیب کی مقدار کے بارے میں سوال کیا تو حضرت نے فرمایا: پانچ یا چھ ضربہ مارو، تاکہ تم ان کے ساتھ مدارا کر سکو۔[29] یہ روایت سند کے لحاظ سے صحیح ہے، کیونکہ زیرا محمد بن یحیٰ العطار، احمد بن محمد بن عیسی الاشعری، محمد بن یحیٰ الخزاز، غیاث بن ابراہیم تمیمی، سارے شیعہ امامی اور ثقہ ہیں۔[30]

جن روایات سے بچوں کو تادیب کے لئے جسمانی سزا دینے کا جواز ثابت ہوتا ہے ان میں وہ روایات بھی ہیں جن میں نقل ہوا ہے کہ بچوں کو نماز میں کوتاہی کرنے پر جسمانی سزا دی جا سکتی ہے۔ جیسا کہ حدیث میں بھی صراحت کے ساتھ حکم فرمایا ہے کہ یتیم کو اسی طرح تنبیہ کرو اور مارو جس طرح اپنے بچوں کو تنبیہ کرتے ہو اور مارتے ہو۔ اب چونکہ یتیم کا مسئلہ بہت حساس مسئلہ ہے اور انسان کو یتیم کے بارے میں بڑی احتیاط کرنے کا حکم ہے، اس کے باوجود بھی روایت میں اس کی تربیت کی خاطر اسے جسمانی سزا اور مارنے کا حکم دیا گیا ہے۔ البتہ جیسا تیرا جی چاہے نہیں بلکہ تنبیہ اپنے مشخص دائرہ میں رہ کر کر سکتا ہے۔[31] رسول خداؐ نے فرمایا: بچوں کو سات سالگی میں نماز کی تعلیم دو اور دس سالگی میں اگر نماز ترک کریں تو ان کو سزا دو۔[32] بچوں کی جسمانی سزا کے جواز پر امام زین العابدین کی حدیث نقل کرتے ہیں: فرماتے ہیں اولاد کا حق تم پر یہ ہے کہ جان لو، وہ تم سے ہے، دونوں جہاں میں ان کا ہر فعل خواہ برا ہو یا اچھا، سب کو تم سے نسبت دی جائے گی، اور تجھے ان کی تربیت کرنے کی ذمہ داری سونپی گئی ہے۔ جیسے اسے ادب سکھانا، اللہ تعالی کی طرف دعوت دینا، اللہ کی اطاعت کرنے میں ان کی مدد کرنا، وغیرہ۔[33]

معصومین علیہم السلام کی سیرت کو بچوں کی جسمانی سزا کے جواز پر تیسری دلیل کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔ بعض کے مطابق معصومین علیہم السلام بھی اپنی اولاد کی تربیت کے لئے سرپرستی اور ولایت کے قائل تھے، جنہیں دیکھ کر شیعہ مجتہدین نے بھی باپ کی ولایت کا حکم لگائے ہیں۔[34] بچوں کی جسمانی سزا کے جواز پر چوتھی دلیل کے طور پر "قاعدہ احسان" کو پیش کیا گیا ہے جس کے مطابق جب بچوں پر تاثیر کا احتمال ہو تو والدین پر ان کی تربیت کرنا واجب

ہے اور یہی احسان کا بہترین مصداق ہے کہ اپنی اولاد کو گناہ سے دور رکھے، عذاب جہنم سے نجات دلائے، اور ابدی سعادت اور خوش بختی سے ہمکنار کرے۔

کون، کتنی سزا دے؟

اگر ثانوی قاعدہ کے طور پر بچوں کو جسمانی سزا دینے کے جواز کو تسلیم کر لیا جائے تو یہاں ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یہ سزا دینے کا حق کسے حاصل ہے؟ تمام علمائے اسلام [شیعہ و سنی] کے مطابق بچے کو سزا دینے کی اجازت بچہ کے والد، دادا، اور حاکم شرع کو دی گئی ہے۔ لیکن استاد یا مربی کے لئے، والد یا دادا کی اجازت کے بغیر ان کے بچے کو سزا دینا ممنوع قرار دیا گیا ہے۔[35] جہاں تک بچوں کو دی جانے والی سزا کی مقدار کے تعین کا تعلق ہے تو اس حوالے سے شیعہ فقہاء کے درمیان اختلاف پایا جاتا ہے۔ بعض مجتہدین اس بات کے معتقد ہیں کہ بچوں کو پانچ سے چھ کوڑے مارے جا سکتے ہیں۔ بعض مجتہدین معتقد ہیں کہ یہ مقدار، احتیاط کا تقاضا ہے۔[36] ان کی دلیل حماد کی امام صادق علیہ السلام سے منقول روایت ہے کہ میں نے امام سے بچہ اور غلام کی تأدیب کے بارے میں سوال کیا تو امام نے فرمایا: پانچ سے چھ کوڑے جائز ہے۔[37] بعض مجتہدین کا کہنا ہے کہ جسمانی سزا کی مقدار دس کوڑے سے کم ہو، اس سے زیادہ جائز نہیں ہے۔ان کی دلیل شیخ صدوق کی یہ روایت ہے: "کسی بھی حاکم کے لئے جو اللہ اور روز قیامت پر ایمان رکھتا ہے، جائز نہیں ہے کہ دس کوڑے سے زیادہ مارے سوائے حدود کے باب میں۔" یہ روایت واضح طور پر دلالت کر رہی ہے کہ دس کوڑے سے زیادہ نہیں مار سکتا۔[38] یہاں ایک نظریہ یہ بھی پایا جاتا ہے کہ بچوں کی جسمانی سزا کی مقدار، خود مربی یا استاد یا والدین کے صواب دید پر ہے کہ بچہ کو کتنا مارے تو وہ سدھر سکتا ہے اور برائی کو یا غیر اخلاقی کام کو چھوڑ سکتا ہے یا نماز کے لئے تیار ہو سکتا ہے۔ مرحوم شہید ثانی رہ اس بارے میں فرماتے ہیں کہ تعزیر اور تأدیب کی مقدار معین کرنے کے لئے خود حاکم کی طرف رجوع کرنا چاہیئے۔[39] اس بارے میں امام خمینی رہ فرماتے ہیں: احوط یہ ہے کہ پانچ یا چھ ضربہ پر ہی اکتفاء کرے۔[40]

جمع بندی اور اہم نکات

بچوں کو سزا دینے کے حوالے سے اس اہم نکتہ کی یاد آوری بہت ضروری ہے کہ اسلام، امن و سلامتی کا داعی ہے۔ جیسا کہ آپ ﷺ نے فرمایا: إِنَّمَا الْمُسْلِمُ مَنْ سَلِمَ الْمُسْلِمُونَ مِنْ يَدِهِ وَ لِسَانِهِ[41] یعنی: "مسلمان تو بس وہی ہے جس کے ہاتھ اور زبان سے مسلمان محفوظ رہیں۔" لہٰذا بنیادی طور پر اسلام میں سزا کا تصور نہیں، فرد اور معاشرے کی فلاح کا تصور پایا جاتا ہے۔ دین اسلام والدین اور اساتذہ کے لئے بہت تاکید کے ساتھ سفارش کرتا ہے کہ بڑے لوگ چھوٹوں کے بارے میں احساس مسئولیت کرتے ہوئے ان کے حقوق کا خیال رکھیں اور ہر وہ عمل

کہ جس سے ان کی بھلائی ممکن ہو اسے انجام دینے میں کوتاہی نہ کریں۔ تاہم بعض اوقات ایک فرد کی بھلائی اور اسے برائی سے روکنے کی غرض سے سزا کا سہارا لینا پڑتا ہے۔ لہٰذا اسلام کی نظر سزا وہ آخری مرحلہ ہے کہ جسے طلاق کی طرح جائز تو قرار دیا گیا ہے لیکن پھر بھی ناپسندیدہ ہے۔ البتہ بچوں کے بارے میں بھی والدین اور اساتذہ کو چاہئے کہ ان کی معمولی معمولی غلطیوں پر سزا دینے سے گریز کرتے ہوئے ان سے تسامح اور سہل انگاری سے پیش آئیں تاکہ وہ اپنی شخصیت کو پہچانتے ہوئے اپنی اصلاح کر سکیں۔

دراصل، بچوں کی شخصیت ابتداء ہی سے بننا شروع ہوتی ہے اور شخصیت اخلاقی، تربیتی، اعتقادی، و حتی والدین کے اقتصادی عناصر، ماں کا دودھ، وغیرہ، ان عوامل میں سے ہیں جو بچہ کی آنے والی زندگی میں اس کی رفتار پر بہت زیادہ مؤثر ہے۔ اور چونکہ تربیت معنی اور اہل لغت کے مطابق اصلاح، ہدایت، اور کردار کی درستگی ہے، لہٰذا یہ کام اس سلیقے سے انجام دیا جائے جو مؤثر اور شرعی طور پر جائز ہو۔ لہٰذا والدین اور اساتذہ پر ضروری ہے کہ بچوں کو سزا دینے سے پہلے ان کی غلطیوں کے اسباب کے بارے میں تحقیق کریں تاکہ مرض کی تشخیص کے بعد اس کا علاج کیا جاسکے۔ رسول خداصلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا فرمان ہے: تعلیم وتربیت کے سلسلے میں اساتذہ اور والدین کو پیار و محبت کے ساتھ پیش آنا چاہئے اور سخت گیری نہیں کرنی چاہئے، کیونکہ پڑھا لکھا، دانشمند، باہنر اور حقیقی استاد وہی ہے کہ جو سختی کئے بغیر بچے کی تربیت کر سکے۔ ہاں مگر خاص موارد میں دینی نظام تربیت میں تنبیہ اور سزا کی بھی اجازت دی گئی ہے کہ جس کی واضح دلیل خود رسول خداصلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا بشیر کے ساتھ ساتھ نذیر ہونا بھی ہے۔ قرآن کریم میں حکم دیا گیا ہے: يا أَيُّهَا الَّذينَ آمَنُوا قُوا أَنْفُسَكُمْ وَ أَهْليكُمْ ناراً (6:66) یعنی: "اے ایمان والو! اپنے آپ کو اور اپنے اہل و عیال کو اس آگ سے بچاؤ جس کا ایندھن انسان اور پتھر ہوں گے۔" اس آیہ شریفہ کا پیغام یہ ہے کہ والدین اور اساتذہ اگر فقط پیار محبت اور شفقت کے ساتھ بچوں کی تربیت نہیں کر سکتے تو گاہے بہ گاہے جسمانی سزا دے کر بھی ان کی اصلاح کریں اور اس میں خود ان کا اپنا ہی فائدہ ہے۔ البتہ ہر حال میں سزا کے اسلامی قوانین کا خیال رکھنا ضروری ہے کہ جس میں سب سے اہم یہ کہ سزا اتنی ہو کہ جو بچہ کے لئے قابل تحمل ہو۔ اسی طرح اس امر کا خاص خیال رکھا جائے کہ بچوں یا شاگردوں کی تربیت اور اصلاح کے لئے سزا اس وقت تک صحیح ہے جب تک وہ مؤثر ہو۔ لیکن اگر سزا کے انفرادی یا اجتماعی سطح پر منفی اثرات مرتب ہو رہے ہوں تو سزا دینے سے پرہیز ضروری ہے۔ کیونکہ سزا کا اصل مقصد انسان کی اصلاح ہے۔ اسلامی نکتہ نظر سے اولاد اور شاگرد والدین اور اساتذہ کے پاس امانت ہیں لہٰذا ان پر یہ ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ جس طرح ان کی جسمانی ضروریات کو پورا کرتے ہیں اسی طرح ان کے روحی، اخلاقی، فکری، عاطفی، عقلانی اور مذہبی ضروریات کو بھی پورا کریں۔ تاکہ ان میں اخلاقی فضائل جیسے پاکدامنی، امانت داری، طہارت اور پاکیزگی جیسے اوصاف پروان چڑھ سکیں اور اسی میں ان کی خیر

مضمر ہے۔[42] بہر صورت، ان ماہرین نفسیات کی بیانات کی روشنی میں معلوم ہوتا ہے کہ بچوں کی جسمانی سزا مکمل طور پر ممنوع نہیں ہے؛ بلکہ بعض اوقات خاص شرائط کے ساتھ جسمانی سزا واجب ہو جاتی ہے۔ لیکن سزا دینے میں درج ذیل کلی قوانین کا خیال رکھنا بہر صورت ضروری قرار دیا گیا ہے:

1. روایات میں سزاوں کے عمدہ پانچ اسباب اور فوائد بیان ہوئے ہیں: ۱) حدود و تعزیرات گناہوں سے پاک ہونے کا باعث ہیں۔ ۲) ان کے تکوینی اور تشریعی اثرات پائے جاتے ہیں۔ جیسے برکتوں کا نزول اور بلاوں کا دفع۔ ۳) خطا کرنے والا دوبارہ خطا نہیں کرتا۔ ۴) جب لوگ خطاکار پر حدود و تعزیرات جاری ہوتے دیکھتے ہیں تو وہ بھی عبرت حاصل کرتے ہیں۔ اسی لئے قرآن کا حکم ہے کہ ایسے موقع پر لوگ یہ منظر دیکھیں: وَلْيَشْهَدْ عَذَابَهُمَا طَائِفَةٌ مِّنَ الْمُؤْمِنِينَ (2:24) یعنی: "مومنین کے ایک گروہ کو ان دونوں (زانیہ اور زانی) کی سزا (جاری ہونے کا منظر) مشاہدہ کرنا چاہیے۔" بنابریں، بچوں کو جسمانی سزا دینے میں بھی مذکورہ بالا فوائد میں سے کوئی نہ کوئی فائدہ ضرور پوشیدہ ہو وگرنہ انہیں سزا دینے سے پرہیز کیا جائے۔ بچوں کو اپنا غصہ اتارنے کے لئے سزا دینا ممنوع ہے۔ ہمیشہ ان کی اصلاح کو مد نظر رکھا جائے۔ امیر المؤمنینؑ نے عمر بن عبدالعزیز کو حکم دیا کہ فلان شخص پر حد جاری کرے، اور اس نے حد جاری کرنے کے دوران چھوڑ دیا، جب اس سے وجہ پوچھی تو کہا: میرا ذاتی غصہ تھا۔ اس کے بعد امام نے فرمایا: اساتذہ کو بھی بچوں کو تنبیہ کرتے وقت ایسا ہونا چاہئے، تاکہ بچوں کی تربیت میں تکامل پیدا ہو جائے۔ اور استاد کو ایسا طریقہ اختیار کرنا چاہیئے کہ اس کے دل میں کوئی ذاتی رنجش یا غم و غصہ نہ ہو، ورنہ ایسی صورت میں اگرچہ تأدیب مؤثر بھی ہو جائے، تب بھی یہ خلاف عدالت ہے۔[43] غصہ کی حالت میں سزا دینے رسول خدا اور امیر المؤمنینؑ نے منع فرمایا ہے۔[44]
2. بچوں کی اصلاح میں جسمانی سزا سب سے آخری حربہ کے طور پر دی جائے۔ اس سے پہلے ان کی اصلاح کے تمام حربے استعمال کرنے چاہیں۔
3. اگر جسمانی سزا ناگزیر ہو تو بچوں کی پیٹھ پر ماریں۔ ہاتھوں اور بالخصوص منہ پر مارنے سے ہر صورت میں پرہیز کیا جائے۔
4. والدین ہوں یا استاد اور مربی حتی سزا دیتے ہوئے بھی بچوں کا مذاق نہ اڑائیں اور ان کی تحقیر نہ کریں۔
5. ماں باپ کے لئے ضروری ہے کہ بچے کو رات کی تاریکی میں اکیلا چھوڑ دینے کی دھمکی نہ دیں۔
6. ماں باپ کے لئے ضروری ہے کہ بچے کو یہ نہ کہیں کہ مجھے تم سے محبت نہیں ہے۔
7. کبھی بچے کو اپنے بہن بھائیوں کے سامنے نہ ماریں۔

8. سزا، جرم کی مقدار سے زیادہ نہ ہو، کیونکہ رسول خدا نے اسد بن وادعیہ سے کہا: اگر سزا دینا ہے تو مقدار جرم سے زیادہ نہ ہو۔[45]

9. سزا بچے کی جسمانی قوت برداشت، عمر، اور شخصیت کے مطابق ہو، جیساکہ حماد بن عثمان نے امام صادقؑ سے روایت کی ہے: حاکم شرع کی صوابدید کے مطابق سزا دے، جہاں وہ مصلحت جانے، اسی طرح اس کے گناہ اور قدرت جسمانی کے مطابق بھی ہو۔[46] ایک اور مقام پر امیرالمؤمنینؑ فرماتے ہیں: عقلمندوں کی سزا، اشارہ ہے اور جاہلوں کی سزا، صراحت کے ساتھ بیان کرنا ہے، اور عاقلوں کو بے عزت کرنا، شدید ترین سزا ہے۔[47]

10. اگر بچہ سزا پانے سے پہلے متنبہ ہو جائے تو اسے سزا نہیں دینی چاہئے، کیونکہ اس کا مقصد، اصلاح ہے۔ جب یہ ہدف خود بخود حاصل ہو جائے تو سزا دینے کی ضرورت ہی نہیں ہے۔

11. بچے کو اس وقت سزا دی جا سکتی ہے جس وہ اپنے کام کی برائی یا گناہ سے باخبر ہو۔ محمد بن خالد کہتے ہیں کہ میں مدینہ میں تھا، ایک غلام کو لایا گیا جس نے چوری کی تھی، اس کے بارے میں امام صادقؑ سے سوال کیا کہ کیا کیا جائے؟ تو امام نے فرمایا: اس بچے سے پوچھو کہ چوری کی سزا کیا ہے اور اس کا کیفر اور عقاب کس قدر ہے، اگر وہ نہیں جانتا تو اسے چھوڑ دو۔[48]

12. جسمانی سزا دینے میں اس کے مراحل اور مراتب کا خیال رکھنا ضروری ہے اور ضعیف مرحلہ سے شروع کرے، جیسے چہرہ کا رخ موڑنا، غصہ میں نگاہ کرنا، کچھ وقفہ کے لئے بات نہ کرنا، وغیرہ۔ اگر ان مراحل میں بچہ متوجہ ہو اور اپنے کئے ہوئے عمل پر نادم ہو اور اسے ترک کرے تو مار پیٹ کی نوبت ہی نہیں آتی۔

* * * * *

حوالہ جات

1۔ علی اکبر، دہخدا، *لغت نامہ دہخدا*۔ مادہ ربو (تہران، انتشارات دانشگاہ، 1349)، ندارد۔

2۔ ایضاً، 2،551۔

3۔ معاونت فرہنگی تربیتی، *تربیت اجتماعی سیاسی از منظر قرآن و نہج البلاغہ* (ندارد، جامعۃ المصطفیٰ العالمیہ، 1389)، 12۔

4۔ علی رضا، اعرافی، *تربیت فرزند با رویکرد فقہی*، تحقیق و نگارش: سید نقی موسوی، (قم، اشراق و عرفان، ندارد)، 15۔

5۔ علی اکبر، دہخدا،*لغت نامہ*، ج15 (تہران،انتشارات دانشگاہ،1349)، 986۔
6۔ ہرگنہان، بیآر،*مقدمہ ای بر نظریہ ہای یادگیری* (ندارد)، 138۔
7۔ علی اکبر، سیف، *روانشناسی پرورش* (تہران،آگاہ،1368)، 264۔
8۔جمال الدین،ابن منظور،*لسان العرب*، ج1 (ندارد، نشرادب الحفدہ،1405)،93۔
9۔ محمد مرتضی، حسینی واسطی، زبیدی، *تاج العروس من جواہر القاموس*، ج1 (بیروت،دارالفکر،1414ق)، 144۔
10۔ احمد بن محمد، فیومی، *مصباح المنیر*، ج1 (ندارد،ندارد،ندارد)، 9۔
11۔ علی ابن محمد، جرجانی، *التعریفات* ، باب ہمزہ (ندارد، دارالتراث العربی،،1424)، 15۔
12۔ سید جواد حسینی، خواہ *تنبیہ بدنی کودکان در نظام بین الملل حقوق بشر و فقہ امامیہ* (ندارد)، 74۔
13۔زین الدین، شہید ثانی،*مسالک الافہام*، ج14 (ندارد، مکتبہ المرتضویہ لاحیاء الاثار الجعفریہ،1429)،255۔
14۔ محمد حسن، نجفی،*جواہر الکلام*، ج41 (بیروت، داراحیاء التراث العربی،ندارد)،255۔
15۔ صالح، المازندرانی، *شرح الکافی-الأصول والروضۃ* ،ج3، 147، «الشرح» ، 145۔
16۔ حسن بن علی، ابن شعبہ،*تحف العقول*، ترجمہ جنتی ناشر (قم، مؤسسہ امیر کبیر تہران،1404)،84۔
17۔ محمد بن الحسن، الشیخ الحر العاملی الشیخ،*وسائل الشیعۃ*، ج1 (قم: مؤسسہ آل بیت علیہم السلام لاحیاء التراث،1409ق): 45۔
18 محمد بن یعقوب، الکلینی،*الکافی*، ج2 (تہران، الاسلامیۃ،1407ق)،350۔
19۔ محمد بن علی، نجاشی، *رجال النجاشی* (قم، جامع مدرسین،1365ش)،59۔
20۔ابوالقاسم، محقق حلی،*شرائع الاسلام فی مسائل الحلال والحرام*، ج4 (قم، دارالہدی،1403)،155۔
21 ۔ محمد بن حسن، طوسی،*المبسوط*، ج4 (ندارد، مکتبۃ المرتضویہ، ندارد)،69۔
22۔ جعفر بن حسن، حلی،*المختصر النافع فی فقہ الامامیہ*، (تہران، بعثت،1410)،222۔
23 ۔ محمد جواد، مغنیہ،*الفقہ علی المذاہب الخمسہ*، ج5 (قم، دارالکتب الاسلامیہ،1380)،633۔
24۔ عبداللہ بن عباس، ابن عباس،*غریب القرآن فی شعر العرب* (بیروت، مؤسسۃ الکتب الثقافیۃ،1413ق)، ندارد۔
25۔ایضا۔
26۔الحر العاملی، *وسائل الشیعۃ*، ج28 : 11۔
27۔الکلینی، الکافی، ج7 : 198۔
28۔ایضا: 267۔
29۔الحر العاملی، وسائل الشیعۃ ،ج28 : 372۔
30۔احمد بن علی، نجاشی، رجال النجاشی (قم، جامع مدرسین،1365ش)،305۔
31۔ الکلینی، الکافی، ج6 : 47 ۔
32۔ علاء الدین بن حسام الدین، متقی ہندی، *کنز العمال*، ج16 (ندارد، مؤسسہ الوفاء،1405)، 440۔
33۔ محمد بن علی، ابن بابویہ،*من لایحضرہ الفقیہ*، ج2 (قم، ندارد،1413ق)،622۔
34۔ نجفی، جواہر الکلام، ج21: 388۔
35۔ سید علی حسینی، زادہ،*تنبیہ از دیدگاہ اسلامی*، مجلّہ حوزہ ودانشگاہ، ش14،15، ص62۔
36۔خوئی، ابوالقاسم، *مبانی تکملۃ المنہاج*، ج1 (قم، ندارد،1396ھ)، 34۔

37۔ الحر العاملی، وسائل الشیعہ ،ج18: 581۔
38۔ابن بابویہ، *من لایحضرہ الفقیہ* ،ج4 : 73۔
39۔ شہید ثانی،*مسالک الافہام*،ج14: 454۔
40۔روح اللہ، امام خمینی، *تحریر الوسیلہ*، ج2(ندارد، سفارت جمہوری اسلامی،1407ھ)، 477۔
41۔محمد بن محمد،الشعیری، *جامع الأخبار* (نجف، ندارد، ندارد)، 107۔
42۔سید جواد، حسن حسینی، *بررسی تحلیلی تنبیہ از منظر روائی، فقہی وروانشناسی*، مجلّہ معرفت، شمارہ33: 53۔
43۔محمد نور، ابن عبدالحفیظ سویدی، *منہج التربیۃ للطفل* (ندارد)، 371۔
44۔محمد باقر بن محمد تقی، مجلسی، *بحار الانوار*، ج79(بیروت، دار إحیاء التراث العربی،1403ق)، 102۔
45۔ایضا،ج78: 82۔
46۔الحر العاملی، *وسائل الشیعہ*،ج18: 584۔
47۔عبدالواحد بن محمد، تمیمی آمدی، *غرر الحکم ودرر الکلم* ،ج2(قم، ندارد، 1366ش)، 501۔
48۔الحر العاملی، *وسائل الشیعہ*،ج3: ص2۔

کتابیات

1) دہخدا، علی اکبر، لغت نامہ دہخدا-مادہ ربو، تہران، انتشارات دانشگاہ،1349۔
2) معاونت فرہنگی تربیتی، تربیت اجتماعی سیاسی از منظر قرآن و نہج البلاغہ، ندارد، جامعۃالمصطفیٰ العالمیہ،1389۔
3) اعرافی، علی رضا، تربیت فرزند با رویکرد فقہی، تحقیق ونگارش: سید نقی موسوی، قم، اشراق و عرفان، ندارد۔
4) بیآر، ہرگنہان، مقدمہ ای بر نظریہ ہای یادگیری، ندارد۔
5) سیف، علی اکبر، روانشناسی پرورش، تہران، آگاہ،1368۔
6) ابن منظور، جمال الدین، لسان العرب، ج1، ندارد، نشر ادب الحفدہ،1405۔
7) حسینی واسطی، محمد مرتضی، زبیدی، تاج العروس من جواہر القاموس، ج1، بیروت، دار الفکر،1414ق۔
8) احمد بن محمد فیومی، مصباح المنیر، ندارد۔
9) جرجانی، علی ابن محمد، التعریفات، باب ہمزہ، ندارد، دار التراث العربی،1424۔
10) خواہ، سید جواد حسینی، تنبیہ بدنی کودکان در نظام بین الملل حقوق بشر و فقہ امامیہ، ندارد۔
11) شہید ثانی، زین الدین، مسالک الافہام، ج14، ندارد، مکتبہ المرتضویہ لاحیاء الاثار الجعفریہ،1429۔
12) نجفی، محمد حسن، جواہر الکلام، ج41، بیروت، دار احیاء التراث العربی، ندارد۔
13) المازندرانی، صالح، شرح الکافی-الأصول والروضۃ۔
14) ابن شعبہ، حسن بن علی، جنتی، احمد، قرن 4 تحف العقول، ترجمہ جنتی ناشر، قم، مؤسسہ امیر کبیر تہران،1404۔
15) محمد بن حسن، شیخ حر عاملی، وسائل الشیعۃ ،ج1، قم، ندارد،1409ق۔

16) کلینی، محمد بن یعقوب، الکافی، ج2، تہران، الإسلامیۃ، 1407ق۔
17) نجاشی، محمد بن علی، رجال النجاشی، قم، جامع مدرسین، 1365ش۔
18) محقق حلی، ابوالقاسم، شرائع الاسلام فی مسائل الحلال والحرام، ج4، قم، دارالہدی، 1403۔
19) طوسی، محمد بن حسن، المبسوط، ج4، ندارد، مکتبۃ المرتضویہ، ندارد۔
20) حلی، جعفر بن حسن، المختصر النافع، فی فقہ الامامیہ، ج، تہران، بعثت، 1410۔
21) مغنیہ، محمد جواد، الفقہ علی المذاہب الخمسہ، ج5، قم، دارالکتب الاسلامیہ، 1380۔
22) ابن عباس، عبداللہ بن عباس، غریب القرآن فی شعر العرب، بیروت، مؤسسۃ الکتب الثقافیۃ، 1413ق۔
23) شیخ حر عاملی، محمد بن حسن، وسائل الشیعۃ، ج28، قم، ندارد، 1409ق۔
24) متقی ہندی، علاء الدین بن حسام الدین، کنزالعمال، ج16، ندارد، مؤسسہ الوفاء، 1405۔
25) ابن بابویہ، محمد بن علی، من لایحضرہ الفقیہ، ج2، قم، ندارد، 1413ق۔
26) نجفی، محمد حسن، جواہر الکلام، ج21، بیروت، داراحیاء التراث العربی، ندارد۔
27) زادہ، سید علی حسینی، تنبیہ از دیدگاہ اسلامی، مجلّہ حوزہ و دانشگاہ، ش15، 14۔
28) ابوالقاسم، خوئی، مبانی تکملۃ المنہاج، قم، ندارد، 1396ھ۔
29) ابن بابویہ، محمد بن علی، من لایحضرہ الفقیہ، ج4، قم، ندارد، 1413ق۔
30) شہید ثانی، زین الدین، مسالک الافہام، ج14، ندارد، مکتبہ المرتضویہ لاحیاء الاثار الجعفریہ، 1429۔
31) امام خمینی، روح اللہ، تحریر الوسیلہ، ج2، ندارد: سفارت جمہوری اسلامی، 1407ھ۔
32) شعیری، محمد بن محمد، جامع الأخبار (للشعیری)، نجف، ندارد، ندارد۔
33) حسن حسینی، بررسی سید جواد، تحلیلی تنبیہ از منظر روایی، فقہی و روانشناسی، مجلّہ معرفت، شمارہ 33۔
34) ابن عبدالحفیظ سویدی، محمد نور، منہج التربیۃ للطفل، ندارد۔
35) مجلسی، محمد باقر بن محمد تقی، بحار الانوار، ج79، بیروت، داراحیاء التراث العربی، 1403ق۔
36) تمیمی آمدی، عبدالواحد بن محمد، تصنیف غرر الحکم و درر الکلم، ج2، قم، ندارد، 1366ش۔

سائنس اور دین کے درمیان رابطہ

INTERRELATION OF SCIENCE & RELIGION

Muhammad Hussain Hafzi
Dr. Qaisar Abbas Jafari

Abstract:
The following article describes the relaio between science and religion. According to the author, along with a deep study of Quran & Hadith and the views of the recognised Muslim scholars and intellectuals, a thorough study of the subject must be done in depth to understand the nature of the interrelation of knowledge and religion. This article examines the importance and virtues of religion and knowledge in the light of Quran & Hadith and the valuable opinions of few authentic personalities in this regard. The article attempts to describe the nature of the relation between knowledge and religion.
Keywords: *Quran, Hadith, Science, Religion, Relation.*

خلاصہ

زیر نظر مقالہ میں سائنس (Science) اور دین (Religion) کے درمیان موجود رابطہ بیان ہوا ہے۔ مقالہ نگار کے مطابق علم و دین کے باہمی رابطہ کی ماہیت سمجھنے کے لئے ضروری ہے کہ اس موضوع پر تمام جوانب سے عمیق مطالعہ کیا جائے اور کتاب وسنت سمیت معتبر مسلمان علماء اور دانشمندوں کے آراء و نظریات کا گہرا مطالعہ ضروری ہے۔ اس مقالہ میں قرآن وحدیث کی روشنی میں دین اور علم کی اہمیت، فضیلت اور اس سلسلے میں چند معتبر شخصیات کی قیمتی آراء کا تقابلی جائزہ لیتے ہوئے علم اور دین کے درمیان پائے جانے والے رابطے کی ماہیت کو بیان کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔
کلیدی کلمات: قرآن، حدیث، سائنس، دین، رابطہ۔

تعریفات، پس منظر اور مفروضات

سائنس اور دین کے باہمی رابطہ کی ماہیت جاننے کے لئے سب سے پہلے ان اصطلاحات کی توضیح ضروری ہے۔ آکسفورڈ ڈکشنری میں سائنس کی تعریف اس طرح ملتی ہے: "مشاہدے اور تجربے کے ذریعے کائنات اور کائنات میں موجودہ اشیاء کا مطالعہ کرنے کو سائنس کہتے ہیں۔" جہاں تک "دین" کی اصطلاح کا تعلق ہے تو عربی زبان میں اس سے چند معانی مراد لیے جاتے ہیں جن میں ایک معنی، "طریقہ" اور "روش" ہے۔ لغت میں جزاء، پاداش، روز قیامت، سیاست، رائے، سیرت، عادت، حساب، اطاعت، دل سے تصدیق اور وحی کے اصولوں پر پابند رہنے کو "دین" کہتے ہیں۔[1] خلیل بن احمد فراہیدی نے دین کیلئے تین معنی یعنی "جزا"، "عادت" اور اطاعت" بیان کیے ہیں۔ کتاب العین میں لکھا ہے: الدِّينُ جمعه الأَدْيَان والدِّينُ الجزاء والدِّينُ الطاعة[2] یعنی: "دین، جس کی جمع ادیان ہے، جزا اور اطاعت ہے۔" جہاں تک "دین" کی اصطلاحی تعریف کا تعلق ہے تو اس کی مختلف تعریفیں بیان کی گئی ہیں۔ دراصل، ہر شخص نے اپنے ذوق اور مطالعے کے مطابق دین کی تعریف کرنے کی کوشش کی ہے۔ اسی وجہ سے ماہرین نفسیات کے ہاں پائی جانے والی دین کی تعریف، سوشیالوجی کے ماہرین کی تعریف سے مختلف ہے۔ اسی طرح مسلمانوں کے ہاں جو دین کی تعریف پائی جاتی ہے وہ غیر مسلم مفکرین کی پیش کردہ تعریفوں سے مختلف نظر آتی ہے۔ علامہ طباطبائیؒ کے مطابق دین کی ایک تعریف عام ہےاور ایک تعریف خاص۔ عام تعریف یہ ہے کہ دین یعنی "راہ و رسمِ زندگی"[3] اور خاص تعریف یہ ہے کہ: "دین، وحی اور نبوت کے ذریعے انسان تک پہنچنے والی تعلیمات کے اس مجموعے کا نام ہے جو مبداء، معاد، عبادات اور معاملات کے قوانین سے مربوط ہو۔"[4] پس اس مقالہ میں "دین" سے مراد وہ تعلیمات ہیں جو کتاب اور سنت میں بیان ہوئی ہیں، چاہئے ان کا تعلق انسان کے عقیدے سے ہو یا عمل سے۔

دین اور سائنس کے باہمی رابطہ کی بحث کے تاریخی پس منظر کا جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ تاریخی لحاظ سے سائنس اور دین کے درمیان رابطے کی بحث کی بنیاد Nicolaus Copernicus کا وہ مشہور نظریہ تھا جس میں اس نے یہ کہا کہ زمین سورج کے گرد گھومتی ہے۔ دوسری طرف عیسائیت میں کتاب مقدس کے مطابق زمین ساکن ہے اور سورج اس کے گرد گھومتا ہے۔ لہٰذا رومی کیتھولک کلیسا ۱۶۱۵ میں کوپر نیک کے نظریے کے کتاب مقدس کے خلاف ہونے کا اعلان کیا۔ جس کے نتیجے میں اس کی کتاب ON THE REVOLUTION OF HEAVENLY SPHERES کو ممنوعہ کتابوں میں سے قرار دے دیا گیا۔ مزید جب کلیسا نے دیکھا گالیلو ہر جگہ کوپرنیک کے نظریے کا دفاع کر رہا ہے تو کلیسا کی طرف سے گالیلو کو ۱۶۳۲ میں فلورانس کی عدالت میں تفتیش کیلئے حاضر کیا گیا اور ۸ سال قید کی سزا سنائی گئی اور وہ اسی حالت میں دنیا سے چلا گیا۔ اس واقعے کے بعد یہ بحث چھڑ گئی کہ سائنس اور دین کے درمیان رابطہ کس قسم

کا؟ پس اس بحث کاآغاز یورپ میں عالم عیسائیت میں ہوا۔ تاہم ہماری بحث میں دین سے مراد، دینِ اسلام ہے کیونکہ اسلام و عیسائیت، دونوں میں کچھ ابحاث اور مسائل مشترک ہیں جن کی وجہ سے اس موضوع کا فقط عیسائیت سے نہیں، بلکہ اسلام سے بھی ربط بنتا ہے۔ مثال کے طور پر معجزہ، انسان کی خلقت اور تکامل، نیز مصیبتوں و بلاوں کے فلسفہ کی بحث عیسائیت اور اسلام، دونوں ادیان میں مشترک ہے۔

جہاں تک دین اور سائنس کے باہمی رابطہ کی ماہیت کے بارے میں مفروضات کا تعلق ہے تو یہاں ایک مفروضہ یہ ہو سکتا ہے کہ دین اور سائنس دونوں ایک دوسرے کی نفی کرتے ہیں۔ دوسرا مفروضہ یہ ہے کہ دین، سائنس کی نفی کرتا ہے لیکن سائنس دین کی نفی نہیں کرتی۔ تیسرا مفروضہ یہ ہے کہ سائنس، دین کی نفی کرتی ہے لیکن دین سائنس کی نفی نہیں کرتا۔ اور چوتھا مفروضہ یہ ہو سکتا ہے کہ دین اور سائنس دونوں ایک دوسرے کے ساتھ ہماہنگ اور بنی نوع بشر کے لئے دونوں ضروری ہیں۔ اس مقالہ میں یہ ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ سائنس اور دین ایک دوسرے کے مقابل نہیں، بلکہ ایک دوسرے کے ساتھ مکمل طور پر ہماہنگ اور بنی نوع بشر کی ترقی و کمال کے لئے دونوں ضروری ہیں۔ ذیل میں ان چاروں مفروضات کی بنیاد پر پیش کئے گئے نظریات پر نقد و تبصرہ پیش کیا گیا ہے۔

سائنس اور دین میں تعارض

کچھ مادہ پرست دانشمندان اور بعض عیسائی مفکرین کا نظریہ یہ ہے کہ سائنس اور دین کبھی ایک جگہ جمع نہیں ہو سکتے۔ یہ نہیں ہو سکتا کہ ایک شخص سائنس دان بھی ہو اور دیندار بھی ہو۔ کیونکہ دین کسی چیز کی حقیقت کو اس طرح بیان نہیں کر سکتا جس پر ہم یقین کر سکیں جبکہ سائنس میں یہ صلاحیت موجود ہے۔ نیز سائنس کوئی ایسا فرضیہ بیان نہیں کرتی جو قابل تجربہ اور ہمارے مشاہدے میں نہ آئے جب کہ دینی نظریات قابل مشاہدہ اور قابل تجربہ نہیں ہیں۔ لہٰذا ان دونوں کے درمیان تعارض ہےاور یہ دونوں قابل جمع نہیں ہیں۔ اس کا بہترین نمونہ گالیلیو اہل کا کلیسا کے ہاتھوں سزا پانا ہے۔ سائنس اور دین کے تعارض کے نظریہ کا جائزہ لینے کے لئے ان اسباب کا جائزہ لینا ضروری ہے جن کی بنیاد پر یہ نظریہ منظر عام پر آیا۔ یورپ میں اس نظریہ کے منظر عام پر آنے کا اہم عامل تحریف شدہ عیسائیت تھی۔ عیسائیوں کی دسترس میں وحیانی کتابیں نہیں تھیں۔ اسی وجہ سے ان کتابوں میں ایسے عقائد اور احکام موجود تھے جو انسان کی عقل کے مخالف تھے۔ عیسائیت میں بہت سارے خرافی عقائد پائے جاتے تھے جو منطق اور عقل کے ساتھ سازگاری نہیں رکھتے تھے۔ ان کا تثلیث کا عقیدہ اتنا سخت اور پیچیدہ تھا۔ اسی طرح عیسائیت کا دین اور سیاست میں جدائی کا انحرافی نظریہ اور وہ انحرافی تعلیمات جن میں خدا اور ماوراء الطبیعہ کی وضاحت موجود تھی۔

یورپ میں دین اور سائنس میں تعارض کے نظریے کا دوسرا اہم عامل، نشاۃ ثانیہ کے بعد سائنسی علوم کا رشد تھا۔ اس دور میں لوگوں نے سائنس کو حد سے زیادہ اہمیت دی اور حد سے زیادہ سائنس پر بھروسا کیا۔ مشہور فرانسوی تجربہ پرست ہولباخ لکھتا ہے: "انسان کیلئے ضروری ہے کہ اپنی تمام تحقیقات میں فزکس اور تجربہ کو وسیلہ بنائے۔" اس کا کہنا ہے کہ دین، اخلاق، سیاست، علوم، ہنر حتیٰ کہ خوشی اور غم میں بھی فزکس اور تجربہ سے مدد لینا چاہیئے۔[5] جب سائنس نے ترقی کی تو کلیسا کے بڑے بڑے پادریوں نے سائنسی اختراعات کا انکار کیا۔[6] اور اہل کلیسا کی اسی تند مزاجی اور افراط و تفریط کی وجہ سے سائنس اور دین میں تعارض اور ناسازگاری کا نظریہ وجود میں آیا۔

اگر ہم جہان اسلام میں اس نظریے کی پیدائش کے عوامل اور وجوہات کو تلاش کریں تو معلوم ہوتا ہے کہ عالم اسلام میں اس نظریے کی پیدائش کے عوامل میں سے ایک اہم عامل اسلامی معاشرے میں اشعری مذہب میں جبر گرائی کا تفکر اور اہل حدیث میں ظاہر گرائی کے تفکر کا رشد ہے۔اشاعرہ جبر گرائی کے قائل تھے اور اس زمانے میں انہیں غاصب حکام کی حمایت حاصل تھی۔ کیونکہ متوکل عباسی کا اپنا جھکاو مسلک جبر اور ظاہر گرائی کی طرف تھا۔ اس زمانے میں مکتب جبر نے بہت رشد کیا اور اہل تعقل کی شدید مخالفت ہوئی۔ متوکل عباسی ہی کے زمانے میں جدل، مناظرہ، تبادل افکار اور تضارب آرا کلی طور پر ممنوع قرار دیا گیا اور اگر کہیں ایسا کرتے ہوئے دیکھا جاتا تو ان کے ساتھ سختی سے پیش آتے جس کی وجہ سے جبر گرائی اور ظاہر گرائی نقطہ اوج پر پہنچی۔ بقول ابن اثیر جو کتاب الکامل میں لکھتے ہیں: سلطان محمود غزنوی نے حکم دیا شہر ری میں موجود تمام کلامی، فلسفی اور نجومی کتابوں کو جلا دیا جائے اور وہاں کے تمام معتزلی مکتب سے تعلق رکھنے والے متکلمین کو جلاوطن کر دیا جائے۔[7] یہ ایسے افکار تھے جو انسان کی عقل کے خلاف تھے۔ جب یہ فکر معاشرے میں رواج پائی تو اسلام میں سائنس اور دین کے درمیان تعارض کا نظریہ عام ہوا۔جہان اسلام میں سائنس اور دین کی جدائی کے عوامل میں سے دوسرا اہم عامل سکولاریزم کا رواج ہے۔ اس تفکر کے مطابق دین کا دائرہ صرف عبادت کی حد تک محدود ہے۔ لہٰذا دین کو دنیاوی معاملات میں نہیں لانا چاہیئے۔

اس نظریے پر عمدہ تنقید یہ ہے کہ اس کی بنیاد تحریف شدہ کتاب مقدس پر رکھی گئی ہے۔ لہٰذا اس کی اسلام میں کوئی گنجائش نہیں ہے۔ کیونکہ اسلام نہ صرف کشفیات علمی سے تضاد نہیں رکھتا، بلکہ جیسے جیسے انسان علوم میں ترقی کر رہا ہے ویسے ویسے قرآن کی حقیقت آشکار ہوتی جارہی ہے۔[8] بدقسمتی سے یورپ کی سائنسی ترقی سے متاثر بعض لوگ یہ کہتے ہیں کہ زمانہ بدل چکا ہے لوگ سائنس کی بدولت آسمانوں پر جا پہنچے ہیں۔ اگر اس زمانے میں بھی ہم دین کے پیچھے پڑے رہیں تو ترقی نہیں کر پائیں گے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ اسلام نے ترقی کا جو تصور پیش کیا ہے، دنیا کی کوئی قوم

پیش نہیں کر سکی۔ کیونکہ اگر ترقی کا معیار انسان کی ضروریات کو پورا کرنا ہے تو جس طرح اسلام انسان کی ضروریات کو پورا کرتا ہے اس طرح کوئی دوسرا دین و مذہب نہیں کرتا۔ کیونکہ اسلام میں انسان کی مادی ضروریات کا پورا پورا خیال رکھا گیا ہے اور اس پر اضافہ یہ کہ اسلام نے انسان کی غیر مادی ضروریات کو بھی پورا کیا ہے۔ انسان ہونے کے ناطے کچھ انسانی ضرورتیں ایسی ہیں جنہیں "عالی ضروریات" کہا جاتا ہے۔ یعنی وہ ضروریات جن کا تقاضا انسان کی پاک فطرت کرتی ہے۔ انسان کی پاک فطرت تڑپ تڑپ کر پکارتی ہے کہ اےئ انسان تو کہاں سے آیا ہے؟ تیرے آنے کا مقصد کیا ہے؟ تجھے کہاں جانا ہے؟ انسان کی یہ اہم ضروت اسلام پوری کرتا ہے۔ لہٰذا دین کے اس کام کو قبول کرنا اور ماننا اس لئے ضروری ہے کہ دین، انسان کی "عالی ضروریات" کو پورا کرتا ہے۔ پس صرف ظاہری مال و دولت زیادہ ہونے کو ترقی نہیں کہتے اور صرف مال و دولت اور شہرت سے انسان کی روح کو سکون نہیں ملتا۔ انسان کی ترقی کا راز اگر اس کی ضروریات کو پورا کرنے میں ہے تو اسلام نے انسان کی انفرادی، اجتماعی اور عالی ضرورت پوری کرکے انسان کے آرام و سکون اور چین و اطمینان کا سامان فراہم کر دیا ہے قرآن مجید کا فرمان ہے: اَلَا بِذِكْرِ اللّٰهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ (28:13) ترجمہ: "آگاہ رہو! اللہ کے ذکر سے دلوں کو اطمینان حاصل ہوتا ہے۔" علامہ اقبال اس آیہ شریفہ کی خوبصورت منظر کشی کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

نہ دنیا سے نہ دولت سے نہ گھر آباد کرنے سے تسلی دل کو ہوتی ہے خدا کو یاد کرنے سے

سائنس اور دین میں تمایز

یہ نظریہ یورپ میں تقریباً ۱۷ صدی میلادی کے بعد سامنے آیا۔[9] بعض غربی مفکرین کے نزدیک سائنس کی اپنی دنیا ہے اور دین کی اپنی دنیا اور ان دونوں کا دائرہ کار ایک دوسرے سے بالکل جدا ہے۔ لہٰذا ان کے درمیان تعارض نہیں، تمایز پایا جاتا ہے۔ ان کا خیال ہے کہ علم اور دین کا موضوع الگ الگ ہے اور ان کی زبان اور روش بھی ایک دوسرے سے جدا ہے، مثلاً دین کا موضوع خدا ہے اور خدا کو وحی کے ذریعے پہچانا جاتا ہے، حالانکہ ہم طبیعت کو حواس کے ذریعے سے پہچانتے ہیں۔ علم کا ہدف جہاں اور مخلوقات کو سمجھنا ہے جب کہ دین کا ہدف اور موضوع خدا ہے۔ یہ لوگ اپنے عقیدے پر دلیل پیش کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ سائنس اور دین کاملاً ایک دوسرے سے جدا ہیں اس کی دلیل یہ ہے کہ سائنس اور دین میں سے ہر ایک کے بارے میں جو سوال جواب ہوتے ہیں وہ کاملا ایک دوسرے سے مختلف ہیں، یہ ممکن نہیں ہے کہ سائنس اور دین کا کام اور ہدف ایک ہو۔[10] یہ نظریہ بھی اسلامی تعلیمات کے ساتھ سازگار نہیں ہے۔ قرآن اور حدیث، انسان کو علوم حاصل کرنے کی ترغیب اور تشویق دلاتے اور مختلف موضوعات یہاں تک

کہ سیاست اور اقتصاد تک کے بارے میں قرآن نے اصول اور احکام بیان کئے ہیں۔اس سے معلوم ہوتا ہے کہ دین انسان کی زندگی کے ہر پہلو کا احاطہ کرتا ہے۔

سائنس اور دین میں تداخل

قرون وسطی کے بعض عیسائیوں اور امام غزالی جیسے بعض مسلمان مفکرین کا نظریہ ہے کہ سائنس، دین کا محتاج اور اس کا ایک حصہ ہے۔[11] ان دانشمندوں کا عقیدہ یہ ہے کہ سائنسی علوم کے دانشمندوں کیلئے ضروری ہے کہ دین کی پیروی کریں اور اپنی تمام تحقیقات اور تجربات دین کے اصول اور قوانین کی روشنی میں انجام دیں۔ کیونکہ انسان کا تجربہ ظنی اور خطاپزیر ہے، لیکن دین جس کی اساس اور بنیاد وحی الہی ہے کبھی بھی خطاپزیر نہیں ہے۔ جب ہم قرون وسطی میں گزرے ہوئے مسیحی دانشمندوں اور مفکروں کے نظریات کا مطالعہ کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ قرون وسطی کے عیسائی اسی نظریہ پر کاربند تھے۔انہوں نے گالیلو کو صرف اس وجہ سے سزا دی کیونکہ اس نے کتاب مقدس کی نصوص کے خلاف نظریہ پیش کیا تھا۔ اسی طرح بعض مسلمان دانشمندوں اور علما کا نظریہ یہ ہے کہ علم، دین کا ایک حصہ ہے کیونکہ دین سائنس کی تشویق دلاتا ہے۔[12] یہاں اگر سائنس اور دین کے تداخل کے نظریہ کا تنقیدی جائزہ لیا جائے تو یہ کہنا پڑے گا کہ یہ نظریہ صحیح نہیں ہے۔ کیونکہ یہ بات اپنی جگہ درست ہے کہ دین کا سائنس کے ساتھ کوئی تعارض نہیں اور دین سائنسی تحقیقات کی پذیرائی کرتا ہے لیکن دین سائنسی علوم کی تمام جزئیات بیان نہیں کرتا۔ لہٰذا سائنسی تحقیق کے ہر موضوع کو قرآن و حدیث سے استخراج کرنے کا نظریہ ایک افراطی نظریہ ہے۔

سائنس اور دین میں توافق

سائنس اور دین کے رابطہ کی ماہیت بیان کرتے ہوئے بعض مفکرین نے یہ کہا ہے کہ سائنس اور دین ایک دوسرے کے ساتھ توافق اور سازگاری رکھتے ہیں۔ دوسرے لفظوں میں سائنس اور دین ایک دوسرے کی تکمیل کرتے ہیں۔ یہ دونوں اس وقت کامل ہیں جب ایک ساتھ ہوں۔ سائنسی علوم میں جتنی ترقی ہو رہی ہے اتنی ہی حقیقتیں کشف ہوتی جارہی ہیں۔ قرآن کہتا ہے فِيهِ شِفَاءٌ لِلنَّاسِ إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَآيَةً لِقَوْمٍ يَتَفَكَّرُونَ (69:16)؛ شہد میں اللہ نے شفا رکھی ہے۔ صدیاں گزرنے کے بعد اس کی حقیقت واضح ہو گئی۔ یا پھر یہ کہ آج ساڑھے چودہ سو سال گزر جانے کے بعد ماہرین تعلیم نے جو بہترین طریقہ تدریس متعارف کروایا ہے وہ یہ ہے کہ بچوں کو تھیوری پڑھانے کے ساتھ ساتھ پریکٹیکل بھی کروایا جائے اور ماڈل یا نمونہ بھی دکھایا جائے تاکہ بچے پرآسانی سے مفہوم واضح ہو سکے یعنی اگر اسے ایپل پڑھاتے ہیں تو ساتھ ساتھ ایک سیب دکھا بھی دیں یا اسے اورنج پڑھاتے ہیں تو ایک سنگترہ دکھا بھی دیں تاکہ اسے لرننگ میں آسانی ہو اور لفظوں کے مفاہیم آسانی کے ساتھ اس کے ذہن نشین ہو جائیں، اس لیٹسٹ تھیوری

کو سامنے رکھتے ہوئے جب ہم دین کی طرف رجوع کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ قرآن کریم نے ساڑھے چودہ سو سال پہلے بشریت کی تعلیم و تربیت کے اسی میتھڈ کو اپنایا کہ جس میں احکام الٰہی کو ایک طرف تھیوری کی شکل میں قرآن مجید میں بیان کیا گیا اور دوسری طرف ماڈل یا نمونے کے طور پر سرکار ختم المرسلینؐ کی زندگی کو پیش کیا اور فرمایا کہ: لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللَّهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ لِمَنْ كَانَ يَرْجُوا اللَّهَ وَ الْيَوْمَ الْآخِرَ وَ ذَكَرَ اللَّهَ كَثِيراً (21:33) ترجمہ: ”بتحقیق تمہارے لئے اللہ کے رسول میں بہترین نمونہ ہے، ہر اس شخص کے لئے جو اللہ اور روز آخرت کی امید رکھتا ہو اور کثرت سے اللہ کا ذکر کرتا ہو۔“ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ دین اور ماڈرن سائنسز میں کوئی اختلاف نہیں بلکہ جس قدر علم ترقی کرتا چلا جائے گا اسی قدر دین اسلام کی حقانیت کھل کر سامنے آتی چلی جائے گی۔

اسی طرح آج سائنس اور ٹیکنالوجی نے یہ بھی ثابت کر دیا ہے کہ انسان اس دنیا میں جو کچھ بولتا ہے تو اس کی ریکارڈنگ ہو جاتی ہے اور وہ فضا کے دامن میں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے محفوظ ہو جاتی ہے، اور اسی طرح جو وہ ایکشن کرتا ہے اس کی بھی فضا میں ویڈیو بن جاتی ہے اور وہ بھی ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ہواؤں میں گردش کرتی رہتی ہے اور کبھی بھی ضائع نہیں ہوتی کہ جس کی ایک جیتی جاگتی مثال ٹیپ ریکارڈرز، آڈیو وڈیو کالز اور دیگر جدید ترین ٹیکنالوجیز ہیں کہ جن میں سے بعض نظام مواصلات میں استفادہ کی جاتی ہیں۔ پس اگر انسان کی آوازیں اس کے منہ سے نکلنے کے بعد مر جاتیں اور ختم ہو جاتیں تو کبھی بھی ہزاروں کلومیٹر دور بیٹھا ہوا دوسرا انسان ایک سم کارڈ یا انٹرنیٹ وغیرہ کے ذریعے اس کی آواز نہ سن سکتا اور نہ ہی اسے ریکارڈ کر سکتا یا اس کی وڈیو دیکھ سکتا۔ یہ آوازیں اسی لئے آسانی سے سنی جاتی ہیں کہ وہ ہوا میں سفر کر رہی ہوتی ہیں اور انہیں ایک سم کارڈ یا انٹرنیٹ کے ذریعے، ہوا سے اخذ کرکے مطلوبہ جگہ پر پیش کر دیا جاتا ہے۔ البتہ کہ سائنس اس بات کو ثابت کرنے میں کامیاب رہی ہے لیکن یہ بتانے سے آج تک قاصر ہے کہ ایسا کیوں کیا جا رہا ہے؟ یہ آوازیں کیوں ریکارڈ کی جا رہی ہیں اور انسان کے تمام ایکشنز کی ویڈیوز کیوں بنائی جا رہی ہیں؟

لیکن جب ہم دین کے پاس جاتے ہیں تو ہمیں پتہ چلتا ہے کہ انسان کے بنانے والے نے اسے پہلے ہی سے متنبہ کر دیا ہے کہ وہ ہر وقت اپنے پیدا کرنے والے کے حضور میں ہے اور اس کا کوئی عمل اس سے پنہاں نہیں ہے، یہاں تک کہ اس کے دل و دماغ میں آنے والے خیالات بھی اللہ تبارک و تعالیٰ سے پنہاں نہیں ہیں، لہٰذا قرآن کریم میں آیا ہے: إِنَّ اللَّهَ عَلِيمٌ بِذَاتِ الصُّدُورِ (119:3) ترجمہ: ”یقیناً اللہ سینوں کے راز خوب جانتا ہے۔“ یا یہ کہ: قُلْ إِنْ تُخْفُوا مَا فِي صُدُورِكُمْ أَوْ تُبْدُوهُ يَعْلَمْهُ اللَّهُ وَيَعْلَمُ مَا فِي السَّمَاوَاتِ وَ مَا فِي الْأَرْضِ وَ اللَّهُ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ (29:3) ترجمہ: ”کہہ دیجئے جو بات تمہارے سینوں میں ہے اسے خواہ تم پوشیدہ رکھو یا ظاہر کرو اللہ بہر حال اسے جانتا ہے نیز آسمانوں اور زمین میں جو کچھ ہے وہ بھی اس کے علم میں ہے اور اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔“ ان سب آڈیوز اور ویڈیو کو محفوظ کرنے کا

فلسفہ یہ بتایا کہ کل جب قیامت کے دن اللہ تبارک و تعالی انسان سے اس کی اس دنیاوی زندگی کے ذرہ ذرہ . إِنَّ اللّهَ لاَ يَظْلِمُ مِثْقالَ ذَرَّةٍ وَإِنْ تَكُ حَسَنَةً يُضاعِفْها وَ يُؤْتِ مِنْ لَدُنْهُ أَجْراً عَظِيماً (40:4) ترجمہ: "یقیناً اللہ (کسی پر) ذرہ برابر بھی ظلم نہیں کرتا اور اگر (کسی کی) ایک نیکی ہو تو (اللہ) اسے دگنا کر دیتا ہے اور اپنے ہاں سے اسے اجر عظیم عطا فرماتا ہے۔" فَمَنْ يَعْمَلْ مِثْقالَ ذَرَّةٍ خَيْراً يَرَهُ٥ وَ مَنْ يَعْمَلْ مِثْقالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَرَهُ (99:7-8) ترجمہ: "پس جس نے ذرہ برابر نیکی کی ہو گی وہ اسے دیکھ لے گا۔ اور جس نے ذرہ برابر بُرائی کی ہو گی وہ اسے دیکھ لے گا۔" کا حساب لے گا تو اس وقت انسان اپنی خاصیت کے پیش نظر اپنے نقصان میں بیان کردہ فیصلوں اور اعمال سے بیزاری اختیار کرے گا اور یہ کہے گا کہ یہ اعمال میں نے انجام نہیں دے ہیں تو اس وقت پروردگار عالم ہواؤں کے دامن سے اس کی اپنی آڈیوز اور وڈیوز اس کے سامنے لاکر اسے دکھا دے گا یہاں تک کہ اس کی نیت تک کا حساب ہوگا کہ جسے نظام تنفس؛ یعنی آکسیجن جو کہ سانس کے ذریعے سینے میں جاتی ہے اور دل و دماغ میں گزرنے والے تمام حالات کی وڈیو بنا کر کاربن ڈائی آکسائیڈ بن کر باہر نکل جاتی ہے، کے ذریعے انجام دیا جائے گا۔ اس سے واضح ہوتا ہے کہ نہ تو سائنس، اسلام کی مخالف ہے اور نہ اسلام سائنس کا دشمن۔ بلکہ دینی تعلیمات اور تھیوری کی پریکٹیکل شکل یا مادی تفسیر کا نام سائنس ہے کہ جس کی دسیوں مثالیں آج کی اس مادی دنیا میں قابل لمس ہیں۔ اور شاید یہی وجہ تھی کہ البرٹ آئن سٹائن نے بھی کہا کہ:

(Science without religion is blind and religion without science is lamb.)

سائنس اور دین کے باہمی ربط کا انداز اس بات سے بھی کیا جا سکتا ہے کہ آج جب میڈیکل سائنسز ترقی کرتے کرتے اپنے کمال کی منزلوں کو چھونے لگیں ہیں تو اس وقت یہ انکشاف ہوا ہے کہ انسانی باڈی میں کٹنے اور جلنے کی تکلیف کا احساس صرف اور صرف کھال چمڑی اور اسکن کو ہوتا ہے اندر ہڈیوں اور گوشت وغیرہ کو نہیں. لیکن جب دین اسلام کی طرف رجوع کرتے ہیں تو قرآن مجید نے پہلے ہی اس بات سے یہ کہتے ہوئے پردہ اٹھا دیا تھا کہ: إِنَّ الَّذينَ كَفَرُوا بِآياتِنا سَوْفَ نُصْليهِمْ ناراً كُلَّما نَضِجَتْ جُلُودُهُمْ بَدَّلْناهُمْ جُلُوداً غَيْرَها لِيَذُوقُوا الْعَذابَ إِنَّ اللّهَ كانَ عَزيزاً حَكيماً (56:4) ترجمہ: "جنہوں نے ہماری آیات کو ماننے سے انکار کیا ہے یقیناً تمہیں ہم عنقریب آگ میں جھلسا دیں گے، جب بھی ان کی کھالیں گل جائیں گی (ان کی جگہ) ہم دوسری کھالیں پیدا کریں گے تاکہ یہ لوگ عذاب چکھتے رہیں، بے شک اللہ غالب آنے والا، حکمت والا ہے۔" لہٰذا توجہ طلب بات یہ ہے کہ قرآن کریم کو کیسے پتہ چل گیا تھا کہ چونکہ کٹنے اور جلنے کی تکلیف کا احساس صرف کھال اور جلد کو ہوتا ہے لہٰذا جیسے وہ جلے گی تو دوبارہ نئی کھال جسم پر چڑھا دی جائے گی تاکہ گناہ گاروں کو اپنے کیئے کی سزا مسلسل ملتی رہے.

اسی طرح دین نے جب قیامت کے دن کی منظر نگاری کی تو کہا وہ دن ایسا ہوگا کہ جب سمندروں میں آگ لگ جائے گی اور فرمایا: وَإِذَا الْبِحارُ سُجِّرَتْ (6:81) ترجمہ: "اور جب سمندروں کو جوش میں لایا جائے گا۔"، اب اس وقت کسی کو یہ بات سمجھ میں نہیں آرہی تھی کہ یہ کیونکر ممکن ہوگا جبکہ سمندروں میں پانی ہوتا ہے اور پانی کا کام آگ کو بجھانا ہے، لیکن سائنس نے آکر آج اس بات کو سمجھنے میں آسانی پیدا کردی ہے اور کہا کہ پانی درحقیقت دو گیسوں آکسیجن اور ہائیڈورجن سے ملکر بنا ہے کہ جن میں سے ایک کا کام آگ کو پکڑنا ہے اور دوسری گیس کا کام آگ کو بھڑکانا ہے، اور اسی کے ساتھ ساتھ جیالوجسٹ یہ کہتے کہ اس زمین کے جگر میں آگ ہے لاوا ہے اتنا گرم ہے اس کا سینا کہ جو فولاد، آئرن اور اسٹیل وغیرہ کے اوزاروں کو پگھلا کر رکھ دیتا ہے. معلوم ہوا کہ جو خدا، دو ایسی گیسوں کو کہ جن میں سے ایک کا کام آگ کو پکڑنا اور دوسری کا کام آگ کو بھڑکانا ہے انہیں آپس میں ملا کر آگ بجھانے والا پانی بنا سکتا ہے وہی خدا کل قیامت کے دن ان دونوں گیسوں کو جدا جدا کرکے زمین کے جگر سے آگ نکال کر سمندروں میں بھی آگ لگا سکتا ہے اور یہ سب کچھ ممکن ہے.

پس معلوم ہوا کہ اسلام، قطعی سائنسی تجربات اور معلومات کی تائید کرتا ہے اور ایسے علوم کو حاصل کرنے کی تشویق کرتا ہے اور دوسری طرف، قطعی سائنسی علوم دینی تعلیمات کی تائید اور قرآن کے معجزہ ہونے کی تصدیق کرتے ہیں۔ [13]اس نظریہ کے مطابق تاریخ بشریت میں سائنس اور دین ہمیشہ انسان کے مورد توجہ رہے ہیں۔ جب انسان نے ایک طرف کائنات میں موجود اشیاء کے اسرار اور طبیعت کے قوانین کو کشف کرنے کی کوشش کی ہے تو دوسری طرف وہ ہمیشہ اپنے پروردگار کی عبادت اور راز و نیاز میں مشغول رہا ہے اور انسان نے اپنے اہداف کو حاصل کرنے کیلئے علم اور دین دونوں سے استفادہ کیا ہے۔ لہٰذا انسان سائنس اور دین کے جمع ہونے کا مرکز اور محور ہے۔

سائنس اور دین کے توافق کے نظریہ کا تنقیدی جائزہ لینے اسے پہلے اس مقدمے پر توجہ ضروری ہے کہ قرآن و حدیث میں "سائنس" کی اصطلاح اپنے رائج معنی میں استعمال نہیں ہوئی۔ اسلامی تعلیمات میں جو اصطلاح استعمال ہوئی ہے وہ "علم" کی اصطلاح ہے جو ایک عام معنی و مفہوم رکھتی ہے اور تمام سائنسی اور غیر سائنسی علوم کو اپنے دامن میں سموئے ہوئے ہے۔ بنابریں، اسلام کے منظر سے سائنس کی اہمیت و ضرورت کو سمجھنے کے لئے سب سے پہلے ان آیات و روایات کا سہارا لینا پڑے گا جن میں بطور کلی، علم کی اہمیت و ضرورت بیان ہوئی ہے۔ علم کی اہمیت کیلئے یہی کافی ہے کہ پیغمبر اکرم ﷺ پر جو آیات سب سے پہلے نازل ہوئیں ان میں علم کی نعمت کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ جیسا کہ اللہ تعالی کا ارشاد ہے: اِقْرَأْ وَرَبُّكَ الْأَكْرَمُ الَّذِي عَلَّمَ بِالْقَلَمِ عَلَّمَ الْإِنسَانَ مَا لَمْ يَعْلَمْ (96:3-5) یعنی: "پڑھو اور تمہارا پروردگار بہت کریم ہے جس نے قلم کے ذریعے تعلیم دی اور انسان کو وہ سب کچھ تعلیم دیا جسے وہ نہیں جانتا تھا۔"

قرآن مجید میں علم کے حصول کی فضیلت کے سلسلے میں سورہ مبارکہ مجادلہ میں ارشاد ربانی ہے کہ روز قیامت درجات پانے کا معیار، ایمان اور علم و دانش ہے : يَرْفَعِ اللهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ ۙ وَالَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ دَرَجٰتٍ(11:58) یعنی: "اللہ نے تم میں سے انہیں برتری عطا کی ہے جو ایمان لائے اور جنہیں علم دیا گیا ان کے درجات کو اللہ نے بلند فرمایا ہے۔" اسی طرح سورہ مبارکہ زمر میں ارشاد خداوندی ہے :قُلْ هَلْ يَسْتَوِي الَّذِينَ يَعْلَمُونَ وَ الَّذِينَ لا يَعْلَمُونَ إِنَّمَا يَتَذَكَّرُ أُولُوا الْأَلْبَابِ(9:39) یعنی: " کہہ دیجئے !کیا جاننے والے اور نہ جاننے والے برابر ہو سکتے ہیں ۔بے شک نصیحت تو صرف عقل والے ہی قبول کرتے ہیں۔"

جہاں تک احادیث میں علم کی فضیلت کا تعلق ہے تو اس حوالے سے "بحار الانوار " میں منقول چند روایات کا مطالعہ کافی ہے۔[14] رسول اکرم ﷺ کا فرمان ہے: طلب العلم فریضة علی کل مسلم الا ان الله یحب بغاة العلم یعنی: "علم کا حاصل کرنا ہر مسلمان پر فرض ہے۔ یاد رکھو! اللہ تعالیٰ علم کی تلاش کرنے والوں کو پسند کرتا ہے۔" اسلام نے حصول علم کا وقت معین نہیں کیا۔ لہٰذا انسان کو فقر و غنی، صلح و جنگ، صحت و بیماری اور جوانی و بڑھاپے کسی حالت میں بھی تحصیل علم سے غافل نہیں ہونا چاہیئے۔ کیونکہ علم نور اور کمال ہے اور نور و کمال کا حاصل کرنا کسی وقت اور حالت کے ساتھ مختص نہیں ہے۔ جیساکہ امام جعفر صادقؑ کا ارشاد گرامی ہے : طلب العلم فریضة علی کل حال یعنی: "علم کا حاصل کرنا ہر حالت میں فرض ہے۔" حصول علم کسی جگہ یا مکان میں منحصر نہیں ہے۔ جیسا کہ رسول اکرم ﷺ کا فرمان ہے: أطلبوا العلم و لو بالصین یعنی: "علم حاصل کرو، اگرچہ تمہیں چین ہی کیوں نہ جانا پڑے۔" امیر المومنین حضرت علی ابن ابی طالبؑ فرماتے ہیں: لا کنز انفع من العلم یعنی: "کوئی خزانہ علم سے زیادہ مفید تر نہیں ہے۔" آپ ﷺ علم اور طالب علم کی اہمیت کو اجاگر کرتے ہوئے ارشاد فرماتے ہیں : ما من خارج خرج من بیته فی طلب العلم إلّا وضعت له الملائکه أجنحتها رضا بما یصنع حتّی یرجع یعنی: "جب بھی کوئی طالب علم حصول علم کی غرض سے اپنے گھر سے نکلتا ہے تو فرشتے اپنے پروں کو اس کے قدموں تلے بچھا دیتے ہیں یہاں تک وہ اپنے گھر واپس پلٹ آئے۔" اس کے علاوہ اور بھی آیات و روایات ہیں جو اہمیت و حصول علم پر دلالت کرتی ہیں اور ساتھ ساتھ صاحبان علم کی ستائش و تعریف بھی کرتی ہیں۔

اسلام کے منظر سے سائنس کی اہمیت و ضرورت کو سمجھنے کے لئے ان آیات و روایات کے علاوہ جو بطور کلی علم کی اہمیت و ضرورت بیان کرتی ہیں، ان آیات و روایات پر توجہ کی ضرورت ہے جن میں حصول علم کے ان وسائل سے استفادہ پر زور دیا گیا ہے جو سائنسی مشاہدے اور تجربے کا وسیلہ ہیں۔ سائنسی مشاہدے اور تجربے کا بنیادی

وسیلہ انسان کے حواس پنجگانہ ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ یہ امر بھی قابل غور ہے کہ کوئی سائنسی تجربہ محض حواس پنجگانہ کے بروئے کار لانے سے حاصل نہیں ہوتا بلکہ حواس کے ماوراء عقل و استنتاج کی طاقت جب تک میدان تجربہ میں وارد نہ ہو، سائنسی مشاہدہ و تجربہ، علم میں تبدیل نہیں ہو سکتا۔ قرآن کریم نے نہ تنہا سائنسی مشاہدے کے ظاہری حواس کے استعمال پر تاکید کی ہے بلکہ ہر سائنسی تجربہ کے تحقق کے اصل وسیلے یعنی عقل و استخراج اور استنتاج کی طاقت کے استعمال پر بھی بہت زور دیا ہے۔ متعدد قرآنی آیات میں حسی مشاہدے پر تاکید کی گئی ہے۔ منجملہ زمین کے مشاہدہ(7:26) ، چوپایوں کے مشاہدہ (36:71) پرندوں کے مشاہدہ (19:67) ایسی آیات ہیں جن سے سائنسی مشاہدے پر زور دیا گیا ہے۔ اسی طرح کم از کم 50 آیات میں أَفَلَا تَعْقِلُونَ جیسی تعابیر کے ذریعے عقلی استنتاج کی اہمیت اور ضرورت بیان کی گئی ہے۔ اب اگر ان آیات کو حسی مشاہدہ کی اہمیت پر دلالت کرنے والی آیات کے ساتھ یکجا دیکھا جائے تو بخوبی سائنسی علوم کی اہمیت کا ادراک حاصل کیا جا سکتا ہے۔ اسی طرح تسخیر کائنات کی اہمیت و ضرورت پر دلالت کرنے والی آیات کے ذریعے بھی اسلامی تعلیمات کے تناظر میں سائنس کی اہمیت پر استدلال کیا جا سکتا ہے۔ خلاصہ یہ کہ اسلام کے نکتہ نظر سے سائنس کی اہمیت و ضرورت مسلم اور قطعی ہے اور دینِ اسلام سائنس کی تعلیم کے ساتھ مکمل طور پر ہماہنگ اور سائنسی تعلیم کے حصول کا بہترین تشویق دلانے والا اور اسے واجب قرار دینے والا دین ہے۔

اس اہم مقدماتی بحث کی روشنی میں اگر دین اور سائنس کے توافق کے نظریہ کا تنقیدی جائزہ لیا جائے تو یہ کہنا پڑے گا کہ یہ نظریہ اگرچہ سابقہ تمام نظریات سے کامل تر اور مناسب تر نظریہ ہے لیکن یہ نظریہ بھی بے عیب و نقص نہیں۔ کیونکہ اس نظریہ میں دین اور سائنس کو دو متقابل حقیقتوں کے طور پر تسلیم کیا گیا ہے۔ البتہ ان دونوں کے درمیان توافق اور سازگاری کا فتوی جاری کیا گیا ہے۔ حالانکہ صحیح یہ ہے کہ سائنس اور دین کا آپس میں سرے سے کوئی تقابل ہی نہیں ہے۔ سائنس دین کے مقابل نہیں اور دین سائنس سے جدا نہیں۔ کیونکہ اگر سائنس عالم کائنات کے اسرار کے مشاہدے، تجربے اور قوانین کے انکشاف کا نام ہے تو یہ کام فعل خدا کی تفسیر ہے۔ کیونکہ کائنات خدا کی خلق کردہ ہے اور جس طرح قول خدا کی تفسیر دین ہے نہ دین کے مقابل، اسی طرح سائنس فعل خدا کی تفسیر اور دین ہے، نہ دین خدا کے مقابل۔ بنابریں، اگر کہیں سائنس اور دین کے درمیان کوئی اختلاف نظر آئے تو یہ ایسے ہے جیسے ظاہری طور پر دو آیات یا روایات یا آیات و روایات میں ظاہری لحاظ سے کوئی اختلاف نظر آرہا ہو۔ ایسی حالت میں مخصوص قواعد کے تحت اس اختلاف کو رفع کیا جا سکتا ہے۔

دین کی اہمیت و ضرورت

سوال یہ ہے کہ آیا سائنس کی تعلیم کافی ہے یا سائنس کی تعلیم کے حصول کے ہمراہ بنی نوع بشر، دینی تعلیمات کے حصول کے بھی محتاج ہیں؟ نیز یہ کہ آیا سائنس دینی تعلیمات کے حصول کے حوالے سے کوئی مثبت یا منفی نظریہ رکھتی ہے یا نہیں؟ ہمارا دعویٰ یہ ہے کہ سائنس کی تعلیم اکیلی انسانیت کے درد کی دوا نہیں بن سکتی، بلکہ انسان کے لئے دین شناسی اور دینداری بھی ضروری ہے۔ نیز یہ کہ سائنس بھی نہ تنہا دینی تعلیم کے حصول اور اس کی اہمیت و ضرورت کی منکر نہیں، بلکہ سائنسی مشاہدات اور تجربات، دینی تعلیمات کی بہترین تائیدات فراہم کرتے ہیں۔ بنابریں، سائنس اور دین کا آپس میں کوئی تقابل یا تعارض نہیں ہے۔ باقی رہا بعض لوگوں کا یہ خیال کہ دین کی تعلیم کا حصول بے سود ہے کیونکہ انسان کیلئے وہی تعلیم اچھی ہے جس سے انسان زیادہ سے کائنات کی تسخیر کرسکے اور دنیاوی لذّت و سکون کا سامان فراہم کرسکے تو یقینا یہ خیال ایک گمان باطل کے سوا کچھ نہیں اور یہ سوچ نادرست ہے۔ اس میں شک نہیں کہ انسان کی دنیاوی ضروریات پوری کرنے کے لئے سائنس کی تعلیم ضروری ہے لیکن سوال یہ ہے کہ آیا ہم دنیا میں ہمیشہ رہنے کے لئے آئے ہیں؟ یقینا نہیں۔ ہر انسان ایک خاص مدت تک عمر گزارنے کے بعد اس دنیا سے چلا جاتا ہے۔ لیکن دنیا سے چلے جانے کا مطلب فنا نہیں، بلکہ آخرت کی زندگی کا آغاز ہے۔ قرآن کی متعدد آیات میں اور رسول اللہ ﷺ کی سنت مبارکہ میں بار بار قیامت اور معاد کا تذکرہ ملتا ہے اور ہماری عقل بھی یہی کہتی ہے کہ ضرور قیامت کے دن حساب وکتاب ہونا چاہئے، عدالت ہونی چاہیئے اور سزا و جزا ہونی چاہیے۔ اگر دنیا وآخرت کے بارے میں اس نظریہ کو اپنالیا جائے تو پھر یقینا انسان کے لئے تنہا سائنس کی تعلیم کافی نہیں ہے۔ بلکہ ہمیں ایک ایسے نصاب تعلیم کی ضرورت ہے جو پڑھ کر ہمیں دنیاوی امتحانوں کے ساتھ ساتھ اخروی امتحانوں میں بھی کامیابی ملے۔ یہ نصاب دین کی تعلیم پانے اور دینی تعلیمات پر عمل پیرا ہونے سے عبارت ہے۔۔ کیونکہ دینی تعلیم وہ نصاب ہے جو دنیاوی اور اخروی دونوں زندگیوں کا منشور اور دستور ہے۔ دین کی تعلیم اس لئے بھی ضروری ہے کیونکہ ہر انسان کا زندگی گزارنے کا کوئی نہ کوئی طور وطریقہ ہوتا ہے، پس ہر انسان کے لئے دین ضروری ہے۔ پس دین بمعنی راہ و روشِ زندگی، ہر انسان کی ضرورت ہے۔ اور اگر دین سے مراد دین کا خاص معنی لیا جائے، یعنی آسمانی ہدایت اور وحیانی تعلیمات کا حصول اور ان کی پابندی تو بھی ہر انسان کے لئے دین کی اہمیت و ضرورت سائنس کی اہمیت و ضرورت سے کم نہیں ہے۔ کیونکہ انسان محض چند روزہ دنیاوی زندگی کی لذتیں اٹھانے کے لئے پیدا نہیں کیا گیا۔ بلکہ حکیم خدا نے انسان کو بنایا ہے تو کسی خاص مقصد اور ہدف کے لئے اور وہ مقصد اور ہدف انسان کو کمال تک پہنچانا ہے۔ انسان کا

کمال یہ ہے کہ وہ سعادت ابدی حاصل کرنے میں کامیاب ہو۔ سائنس انسان کو دنیاوی زندگی کا کمال عطا کرسکتی ہے لیکن ابدی کمال، تنہا دین کے احکام پر عمل کے ذریعے ممکن ہے۔

اس حوالے سے علامہ طباطبائی فرماتے ہیں: قرآن مجید انسان کو ہمیشہ رہنے والی زندگی اور سعادت ابدی کی طرف رہنمائی کرتا ہے اور اسی طرح انسان کو نجات حاصل کرنے کے راستوں کی بھی نشان دہی کرتا ہے۔ جس کیلئے قرآن نے مختلف قوانین وضع کئے ہیں۔ اگر انسان اپنی زندگی میں ان قوانین کی پیروی کرے تو وہ سعادت دارین حاصل کرنے میں کامیاب ہوگا۔[15] لہٰذا دین ایک ایسی روش زندگی کا نام ہے جسے انسان سعادت ابدی حاصل کرنے کیلئے اپناتا ہے۔ اس میں دنیاوی زندگی گزارنے کے اصول اور قوانین کو بیان کرنے کے ساتھ ساتھ اخروی زندگی کے قوانین اور اصول بھی بیان ہوچکے ہیں۔[16] علامہ اس دین کو دین حق سے تعبیر کرتے ہیں جو انسان کو حقیقی معارف، اخلاق فاضلہ اور نیک اعمال کی طرف دعوت دیتا ہو۔[17] ایسا دین جس میں دنیاوی اور اخروی زندگی کے تمام اصول و قواعد بیان ہوئے ہوں وہ صرف دین مبین اسلام ہے۔ خلاصہ یہ کہ یہ کہنا صحیح نہیں ہے کہ سائنس کے ہوتے ہوئے دین کی کیا ضرورت ہے۔ سائنس انسان کے بنیادی سوالوں کا جواب دینے کی صلاحیت نہیں رکھتی۔ سائنس انسان کی مادی احتیاجات کو پورا کرتی ہے لیکن انسان کی انسانی اور روحی احتیاجات کو پورا کرنے سے قاصر ہے۔ پس انسان ہمیشہ دینی ہدایت کا محتاج رہے گا۔

نتیجہ

سائنس اور دین دو ایسی چیزیں ہیں جو قابل انفکاک نہیں۔ لہٰذا دین کے نام پر سائنس کی مخالفت درست نہیں اور سائنس کے نام پر دین کی تضحیک سراسر غلط ہے۔ علامہ ڈاکٹر محمد اقبال کی نظر میں سائنس اگر انسان کو اللہ سے دور کرنے کا سبب بنے فتنہ ہے:

اللہ سے کرے دور تو تعلیم بھی فتنہ　　　املاک بھی اولاد بھی جاگیر بھی فتنہ
ناحق کیلئے اٹھے تو شمشیر بھی فتنہ　　　شمشیر ہی کیا نعرہ تکبیر بھی فتنہ

البتہ اس امر پر توجہ ضروری ہے کہ دین اسلام، وحی الٰہی کے ذریعے ہم تک پہنچا ہے اور جو دین وحی پر مشتمل ہو اس میں خطا کا امکان نہیں ہوتا ہے۔ اس کے برعکس، سائنس کا تعلق تجربے اور مشاہدے سے ہے جو انسانی افعال ہیں جن میں غلطی ہوسکتی ہے۔ کیونکہ تجربے اور مشاہدے کا تعلق حواس خمسہ سے ہے جن سے خطا کا امکان بذات خود ایک مسلمہ سائنسی حقیقت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہر دس سال بعد نئی سائنسی تحقیقات پرانی تحقیقات کی جگہ لے لیتی ہیں۔ لہٰذا اگر انسان کا تجربہ یا مشاہدہ کتاب و سنت کے نصوص سے متضاد ہو تو اس صورت میں کتاب و سنت کو ہی

ترجیح دی جائے گی اور تجربہ و مشاہدہ کی تاویل کی جائے گی۔ کیونکہ کتاب و سنت کے بیان کردہ قطعی حقائق اور نصوص میں کوئی تضاد نہیں پایا جاتا: اَفَلَا یَتَدَبَّرُونَ الْقُرْآنَ وَلَوْ کَانَ مِنْ عِنْدِ غَیْرِ اللہِ لَوَجَدُوا فِیهِ اخْتِلَافًا کَثِیرًا (82:4)
ترجمہ: "کیا وہ قرآن میں تدبر نہیں کرتے، اگر وہ اللہ کے سوا کسی کی جانب سے ہوتا تو وہ اس میں اختلاف پاتے۔"

*****

حوالہ جات

1۔ جعفر، سجادی، *فرہنگ علوم نقلی و ادبی* (تہران، مؤسسہ مطبوعاتی علمی، 1344)، 273۔
2۔ خلیل ابن احمد، فراہیدی، *العین*، ج 8 : 73۔
3۔ محمد حسین، طباطبائی، *شیعہ در اسلام* (قم، دفتر انتشارات اسلامی، 1378) 21۔
4۔ محمد حسین، طباطبائی، *المیزان فی تفسیر القرآن*، ج 5، ج 1 (قم، دفتر انتشارات اسلامی، 1417 ق) ، 424۔
5۔ مہدی، گلشنی، *از علم سکولار تا علم دینی* : 21۔
6۔ پترسون، مایکل و همراهان، *عقل و اعتقاد دینی*، ترجمہ احمد نراقی و ابراہیم سلطانی (تہران، انتشارات طرح نو، 1379ھ، ش): 358-363۔
7۔ ابن اثیر، *الکامل فی التاریخ*، ج 9 (بیروت: دار صادر، طبع 1966ء)، 372۔
8۔ محمد رضا رضایی، اصفہانی، *شبہات جدید قرآنی* (ندارد، ندارد، ندارد) 26۔
9۔ ایضا: 33۔
10۔ عبد الحمید، خسرو پناہ، *مسائل جدید کلامی و فلسفہ دین* (قم، دفتر تبلیغات اسلامی، ندارد) 272۔
11۔ ایضا: 268-269۔
12۔ گلشنی، *از علم سکولار تا علم دینی*: 49۔
13۔ رضایی، اصفہانی، *شبہات جدید قرآنی*: 34۔
14۔ الشیخ محمد، باقر المجلسی "بحار الانوار" ج 1 (بیروت، مؤسسۃ الوفاء الطبع الثانیہ، سنۃ 1993ء) 172 و 206۔
15۔ طباطبائی، *المیزان فی تفسیر القرآن*، ج 8 : 300۔
16۔ محمد حسین، طباطبائی، *بررسی ہای اسلامی*، ج 1 (قم، بوستان کتاب، 1388) 35-36۔
17۔ ایضاً: 551۔

کتابیات

1) سجادی، جعفر، فرہنگ علوم نقلی وادبی، تہران، مؤسسہ مطبوعاتی علمی، 1344۔

2) فراہیدی، خلیل ابن احمد، العین۔

3) طباطبائی، محمد حسین، شیعہ در اسلام، قم، دفتر انتشارات اسلامی، 1378۔

4) طباطبائی، محمد حسین، المیزان فی تفسیر القرآن، قم، دفتر انتشارات اسلامی، 1417ق۔

5) پترسون، مایکل وہمراھان، عقل و اعتقاد دینی، ترجمہ احمد نراقی و۔۔۔ تہران، انتشارات طرح نو، 1379ھ، ش ۔

6) گلشنی، مہدی، از علم سکولار تا علم دینی، ندارد، ندارد، ندارد۔

7) ابن اثیر، الکامل فی التاریخ، ج9، بیروت: دار صادر، طبع 1966ء۔

8) اصفہانی، محمد رضا رضایی، شبہات جدید قرآنی، ندارد، ندارد، ندارد۔

9) خسرو پناہ، عبد الحمید، مسائل جدید کلامی و فلسفہ دین، قم، دفتر تبلیغات اسلامی ، ندارد۔

10) باقر المجلسی، الشیخ محمد، بحار الانوار، بیروت، مؤسسۃ الوفاء الطبع الثانیہ، سنۃ 1993ء۔

11) طباطبائی، محمد حسین، المیزان فی تفسیر القرآن، قم، دفتر انتشارات اسلامی، 1417ق۔

12) طباطبائی، محمد حسین، بررسی ہای اسلامی، قم، بوستان کتاب، 1388۔

EDITORIAL BOARD

Patron in Chief

Syed Imtiaz Ali Rizvi

Patron

Syed Ali Murtaza Zaidi

Editor in Chief

Syed Hasnain Abbas Gardezi

Editor

Dr. Sh. Muhammad Hasnain

Associate Editor

Dr. Qaiser Abbas Jafri

Director NMT

S. Rameez ul Hasan Mosvi

Dr. Roshan Ali

IMCB, Islamabad

Dr. Ali Raza Tahir

Punjab Univeristy, Lahore

Dr. Sajid Ali Subahani

MIU, Islamabad

Dr. Abou Turab

QIU, Islamabad

NATIONAL ADVISORY BOARD

Dr. Syed Nisaar Hussain Hamdani

AJKU, AJK.

Dr. Hafiz Muhammad Sajjad

AIOU, Islamabad.

Dr. Karam Hussain Wadhoo

Larkana Regional Directorate of Colleges

Dr. Qandeel Abbas Kazmi

QIU, Islamabad.

Dr. Muhammad Riaz

University of Baltistan, Skardu.

INTERNATIONAL ADVISORY BOARD

Dr. Syed Rashed Abbas Naqvi

Ahlulbayait Univ. Tehran, Iran.

Dr. Yaqoob Bashvi

MIU, Qum, Iran.

Dr. Syed Talmeez Hasnain Rizvi

New Jerci, America.

Dr. Ghulam Hussain Meer

MIU, Qum, Iran.

Dr. Sukaina Hussain

Australia

ISSN 2221-1659 Declaration No: 7334

Quarterly social & religious research journal

NOOR-E-MARFAT

Vol. 10 Issue: 3 Continues Issue: 45

July to September 2019

Accordingly

Ziqaad to Muharam 1441 Hijri

Editor

Dr Sh. Muhammad Hasnain

Noor-ul-Huda Markaz-e-Tehqeeqat (Islamabad)

E-mail: noor.marfat@gmail.com

QUARTERLY SOCIAL & RELIGIOUS RESEARCH JOURNAL

NOOR-E-MARFAT

Vol. 10 Issue:3 Continues Issue: 45 July to September 2019

A CRITICAL ANALYSIS OF UN 2020

SEMANTICS OF DIVINE ATTRIBUTES

THE DIGNITY OF HAZRAT FATIMA (a.s)

INTERRELATION OF SCIENCE & RELIGION

CORPORAL PUNISHMENT IN EDUCATION

HUMANITY, ECONOMICS & ENVIRONMENT

R0LE OF LITERATURE IN SOCIAL DEVELOPMENT

UPBRINING-LEXICAL CONNOTATION & FEATURES

BASIC PRINCIPALS OF EDUCATION & UPBRINGING

www.nmt.org.pk

Noor ul Huda Markaz-e-Tehqeeqat (Islamabad)